19

قائداعظم لائبریری کا ادبی مجلّہ

(ڈاکٹر وحید قریشی نمبر)

مخزن

ڈاکٹر وحید قریشی (مرحوم)

۱۹

قائداعظم لائبریری کا شش ماہی ادبی مجلّہ
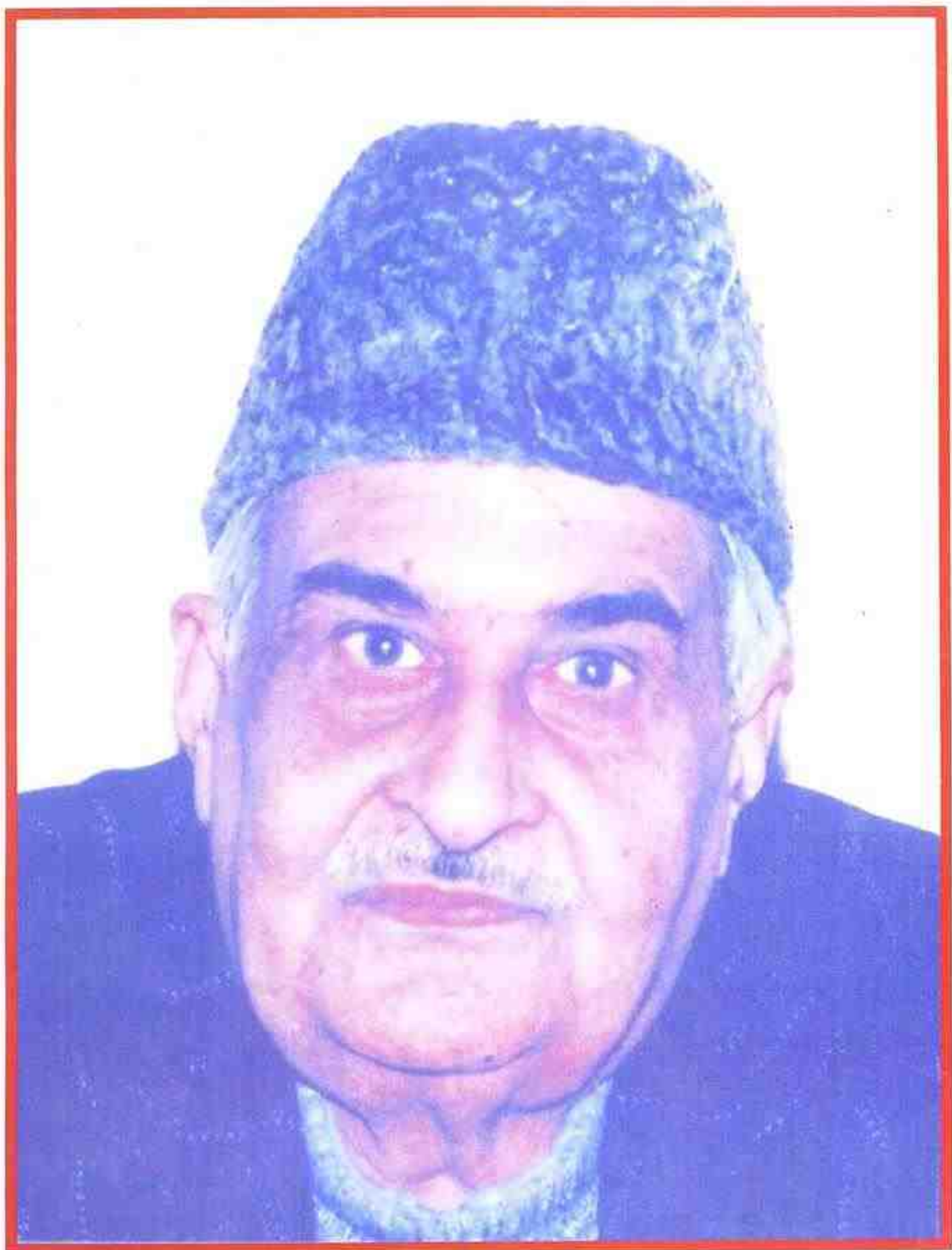
(ڈاکٹر وحید قریشی نمبر)

مدیر: شہزاد احمد

قائداعظم لائبریری، شاہراہِ قائداعظم، باغ جناح، لاہور

مخزن

شمارہ مسلسل ۱۹

۲۰۱۰ء

جلد ۱۰ شمارہ ۱

ناشر: محمد تاج، چیف لائبریرین قائد اعظم لائبریری، لاہور
فون نمبر: ۹۹۲۰۱۰۰۷_ فیکس: ۹۹۲۰۱۰۰۶
ای میل: qallahore@gmail.com
ویب سائٹ: www.qal.org.pk
کمپوزر: محمد اکرام الحق
طابع: قومی ایڈورٹائزنگ، رائل پارک، لاہور
صفحات: ۱۶۸
قیمت:/- ۱۰۰ روپے

ضروری نوٹ

(۱) مخزن میں شائع ہونے والی نگارشات کے مندرجات سے قائد اعظم لائبریری اور مجلس ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
(۲) تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے روانہ کیجیے۔
(۳) ادبی معاملات میں جملہ خط و کتابت مدیر مخزن، معرفت قائد اعظم لائبریری، شاہراہ قائد اعظم، باغ جناح لاہور سے کی جائے۔
(۴) مالی امور میں چیف لائبریرین قائد اعظم لائبریری سے رجوع کیا جائے۔
(۵) اس شمارے کے مضامین پر اپنی رائے سے نوازیں۔

ترتیب

تصانیف وتالیفات

انتخاب شاعری

اداریہ

مخزن، اردو ادبیات کا ایسا ماخذ ہے، جس کے سلسلے ہر دور کی تاریخ میں جاری و ساری ہیں، گو اس کا آغاز سر عبدالقادر نے کیا تھا، تاہم مجلّہ 'مخزن' کا یہ انیسواں شمارہ دورِ جدید کے اس سقف کی اگلی کڑی ہے، جس کی اساس مرحوم و مغفور ڈاکٹر وحید قریشی نے استوار کی تھی۔ ایک نابغۂ روزگار شخصیت ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی، تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور تنظیمی جہتیں اس قدر وسیع اور عظیم الشان ہیں کہ ان کے انکشاف میں آنے والا ایک زمانہ صرف ہوگا۔ فی الوقت دنیائے علم و ادب ان کی فرقت کے صدمے سے دوچار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے سانحۂ ارتحال سے لے کر اس وقت تک ان کے بارے میں جس نوع اور جس سطح کا کام ہونا چاہیے تھا، ویسا تو ممکن نہیں ہو پایا۔ فقط کلمات تاسف یا ان کے اقوال و اذکار کی گونج ہی محسوس کی جا سکتی ہے۔ تاہم ان کے پایہ تکمیل کو پہنچے ہوئے یا زیرِ تکمیل گراں مایہ منصوبے اس قدر ہیں کہ کوئی بڑا ناقد اور محقق زندگی وقف کرے تو یہ کام مکمل ہو پائے گا۔ باوجودے کہ زیرِ نظر شمارے میں ڈاکٹر صاحب کی مجلسی، معاشرتی، نجی اور انتظامی زندگی کے معدودے چند پہلوؤں پر ان کے معاصرین اور متاثرین کے مضامین یکجا کیے جا رہے ہیں۔ آنے والے وقت میں یقیناً مخزن میں ان کے تحقیقی کام سے متعلق مزید سنجیدہ مواد شاملِ اشاعت کیا جاتا رہے گا۔

'مخزن' کی ادارت پر فائز ہونے کے موقع پر مجھے ڈاکٹر صاحب سے اپنی نسبت بہت یاد آئی۔ المختصر جب میں ۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا تو وحید قریشی صاحب کا ڈنکا بج رہا تھا۔ وہ شبلی کی حیات معاشقہ لکھ چکے تھے اور حلقۂ اربابِ ذوق کی محفلوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ وہ شدید قسم کے فقرہ باز تھے لیکن اگر کوئی ان پر فقرہ کسنے کی کوشش کرے تو اس پر زندگی حرام کر دیتے تھے۔ وہ میرے بزرگوں میں سے تھے اور سوائے ایک آدھ واقعے کے کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوئے تھے۔ ویسے بھی وہ مظفر علی سید کے دوست تھے اور مظفر علی سید میرا جگری دوست تھا۔ میری ان سے پہلی ملاقات گوجرانوالہ میں ہوئی تھی جہاں وہ اور مظفر علی سید دونوں پڑھاتے تھے۔ مظفر علی سید گھنٹوں ان کے بارے میں باتیں کرتا تھا، وہ خود بھی بے حد زیرک اور پڑھا لکھا تھا، لہٰذا میرا قریشی صاحب سے ہمیشہ احترام کا رشتہ قائم رہا۔ دوستی کی سطح کبھی نہیں بن سکی۔

جس زمانے میں وہ مقتدرہ میں تھے، میں نے ایک کتاب ان کو بغرض اشاعت بھجوائی تھی (نفسیات کا حیاتیاتی پس منظر) ان دنوں میں سخت بیمار اور موت کے پنجے سے رہائی پا کر آیا تھا۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی، وحید قریشی صاحب نے مجھے پیش کش کی تھی کہ میں نفسیات کی کسی کتاب کا ترجمہ کر کے ان کو بھجواؤں مگر وہ تو میں بوجوہ نہ کر سکا مگر میری مذکورہ بالا کتاب کو شائع کرنے کے لیے قریشی صاحب تیار ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے میرے مسودے پر نظر ثانی کی تھی، مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میرا مسودہ پہلے سے

کہیں بہتر ہو گیا تھا۔ خاص طور پر ایک بات جو میں یہودیوں کے بارے میں لکھتا تھا اور ان کے بارے میں اب بہت جذباتی باتیں کی تھیں، ڈاکٹر صاحب نے وہ جذباتی مواد پورے کا پورا نکال دیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا تھا کہ تنقید کرتے وقت جذباتی ہو جانا کسی طرح درست نہیں تھا۔

وحید قریشی صاحب بقول غالب دوست کے کلام کو دشمن کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب وہ تنقید پر اتر آتے تو پھر امان ملنی مشکل ہو جاتی تھی۔ گلڈ کے ایک الیکشن میں مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کے باوجود ہمارے تعلقات زیادہ دیر تک کشیدہ نہ رہ سکے تھے۔ بیماری کے دوران وہ کبھی کبھی مجھے فون کرتے تھے اور نہ آنے کا گلہ بھی کرتے تھے مگر میں دو ایک بار سے زیادہ انھیں دیکھنے نہ جا سکا۔ ایک تو ان کا گھر بہت دور تھا، پھر ان کی حالت بھی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔

وہ ہمہ صفت شخصیت نقاد، استاد، تاریخ دان، شاعر، دھڑے باز، نہایت نرم گوشہ رکھنے والے بھی کچھ تو تھے۔ میں نے کسی اور کی ذات میں ان خوبیوں کو یک جا نہیں پایا۔

ڈاکٹر طارق عزیز نے اس خصوصی شمارے میں اشاعت کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی کی تصاویر مہیا کیں، جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

جب مجھے 'مخزن' کی ادارت سونپی گئی تو خاصی مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا، جس طرح کی عمیق نظری وحید قریشی کی ذات میں تھی، میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جس قدر محنت اور لگن سے وہ کام کرتے تھے، اگر مجھے اس سے آدھی بھی نصیب ہو جائے تو میں خود کو خوش قسمت خیال کروں گا، تاہم مجھے معلوم ہے کہ میں ان جیسی ادارت نہیں کر سکتا، مگر قارئین سے یہ توقع ضرور رکھتا ہوں، وہ مجھے اس معیار پر نہیں پرکھیں گے جو وحید قریشی صاحب نے 'مخزن' کے لیے مقرر کیا ہے۔

شہزاد احمد
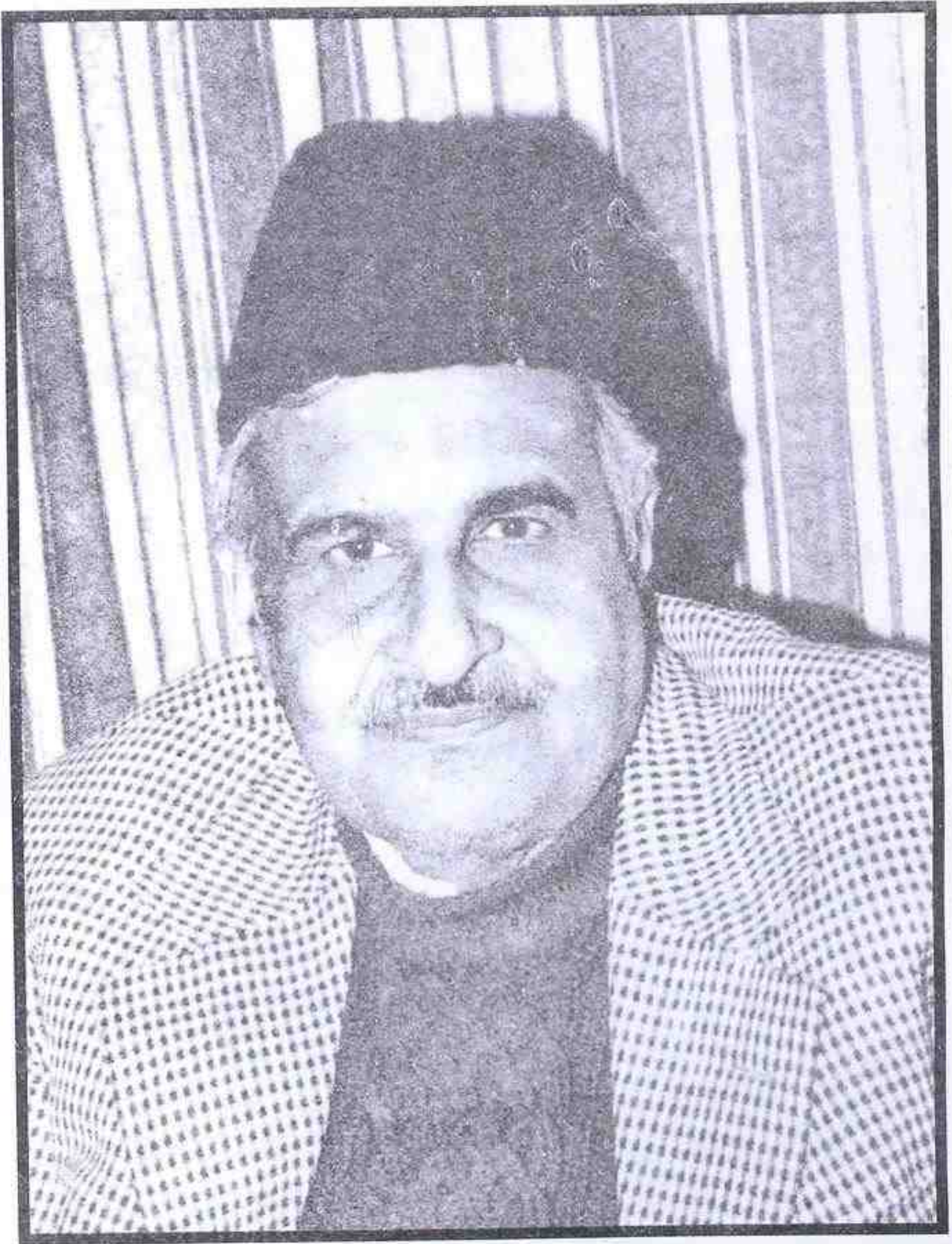
ڈاکٹر وحید قریشی (مرحوم)

وحید العصر۔ ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر وحید قریشی کی وفات کی خبر سنی تو دل سے ایک آہ نکلی اور لب پر یہ مصرع آ گیا:

''جو بادہ کش تھے، پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں''

اور اس کے ساتھ ہی زبان پر اس شعر کا دوسرا مصرع رواں ہو گیا جس میں ساقی سے التجا کی گئی ہے:

''کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی''

دوستوں میں سے جس کسی نے سنا فوراً بول اٹھا:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کی موت ایک عام آدمی کی موت نہیں تھی، ان کی وفات سے اردو ادب کی وہ عظیم شخصیت رخصت ہو گئی تھی جو ہمہ وقت خود فعال رہتے تھے اور دوسروں کو ادبی سطح پر متحرک رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ قبل وہ اپنا سمن آباد والا مکان، جو شہر کے عین وسط میں تھا، چھوڑ کر ملتان روڈ پر ایک کشادہ کالونی میں چلے گئے تھے۔ المیہ یہ ہوا کہ وہاں جا کر ایسے بیمار ہوئے کہ چلنا پھرنا موقوف ہو گیا۔ اور وہ بستر کے ساتھ لگ گئے۔ یہ کالونی فصیل میں گھرے ہوئے مرکزی لاہور سے اتنی دور تھی کہ ذاتی گاڑی کے بغیر وہاں پہنچنا مشکل تھا۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے رابطے شدید علالت کے دور میں بھی قائم رکھے، ہر صبح نو بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو مجھے یقین ہوتا کہ یہ کال (Call) ڈاکٹر صاحب کی ہو گی اور واقعی ان کی ہی ہوتی، پہلے مختصر سا ذکر اپنی علالت کا کرتے اور پھر ادب کے موضوعات چھیڑ دیتے۔ ٹیلی فون کے ذریعے وہ پورے ملک کے ادیبوں کے ساتھ رابطے میں تھے اور ان کی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کرتے تھے۔ افسوس ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو یہ رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا اور وہ ادبی دنیا میں ایک خلا چھوڑ کر عقبیٰ کو روانہ ہو گئے۔

اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ ان سے پہلا غائبانہ تعارف نریش کمار شاد کے رسالہ ''چندن'' میں ہوا تھا۔ اس پرچے میں ان کا ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا جس کے کاٹ دار لہجے نے میرے طالب علمانہ ذہن کو بہت متاثر کیا تھا اور پھر میں ان کے مضامین جہاں کہیں دیکھتا ضرور پڑھتا۔ ان سے زیادہ تفصیلی تعارف ان کی کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' سے ہوا جو چھپتے ہی ایک متنازع کتاب بن گئی تھی۔ اس کتاب میں مولانا شبلی کو علم نفسیات کے حوالے سے پرکھا گیا تھا اور اس ادبی و نفسیاتی مطالعے کی اساس ان کے خطوط پر رکھی گئی تھی جو انھوں نے عطیہ فیضی کو لکھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی مولانا شبلی کے باطن میں

ایک جمال پرست انسان موجود تھا۔ لیکن شبلی نعمانی کی شخصیت کے گرد تقدس کا منور حلقہ گردش کر رہا تھا۔ اس کتاب نے تقدس کے اس حلقے کو توڑنے کی ''جسارت'' کی تھی۔ چناں چہ ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا، جسے ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی جرأت اور جواں مردی سے برداشت کیا۔ لمبے عرصے کے بعد ڈاکٹر ابن فرید نے نفسیات کی نئی روشنی میں جب شبلی نعمانی کا مطالعہ متذکرہ زاویے سے کیا تو انھوں نے بھی وہی نتائج اخذ کیے جو ڈاکٹر وحید قریشی نے پیش کیے تھے۔ ابن فرید نے وحید قریشی کے خلاف نقطۂ اعتراض اٹھانے والوں کو تنگ نظر قرار دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ابن فرید صاحب پاکستان آئے تھے تو ان کے ساتھ ایک نشست ''بزم اقبال'' میں ڈاکٹر وحید قریشی کے کمرے میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے مقالے کو عالمانہ نفسیاتی مطالعہ قرار دیا اور کہا کہ ''اس سے مولانا شبلی نعمانی کے تقدس پر کوئی حرف نہیں آتا۔'' (واضح رہے کہ وحید قریشی صاحب نے فسادِ خلق کو ختم کرانے کے لیے اس کتاب کی اشاعت بند کرا دی تھی۔ حال ہی میں لاہور کے ایک ناشر نے ڈاکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر یہ کتاب چھاپ دی لیکن اب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور اخلاقی قدروں میں بڑی تبدیلی آ چکی ہے)۔ قیوم نظر صاحب کے رسالہ ''کتاب'' میں ان کی ایک پیروڈی نے بھی بہت شہرت حاصل کی تھی اور ان کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ وہ جس بات کو صداقت پر مبنی سمجھتے تھے اسے پیش کر دیتے تھے۔ اس قسم کی ایک اور مثال ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' پر ڈاکٹر وحید قریشی کا محاکمہ ہے۔ الطاف حسن قریشی کے رسالہ ''زندگی'' میں انھوں نے ''ترقی پسند تحریک'' پر ایک سلسلہ مضامین لکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے ترقی پسند ادبا ان کی ذاتی مخالفت پر اتر آئے، لیکن جانبداری کی مسموم فضا میں بھی ڈاکٹر وحید قریشی کی پذیرائی وسیع پیمانے پر ہوئی۔ چناں چہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے ان کی زندگی میں لکھا تھا:

> ''ڈاکٹر وحید قریشی کثیر الجہات آدمی اور ادیب ہیں۔ بنیادی طور پر انھیں ایک ادبی محقق کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ انھوں نے تحقیق کے میدان میں اہم نقوش قائم کیے۔ وہ ایک اچھے نقاد بھی ہیں۔ ادبی کتابوں کی ترتیب و تدوین کو بدقسمتی سے اردو کی ادبی دنیا میں اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ وحید قریشی نے اس میدان میں بھی اپنی نظر اور تنقیدی شعور کا ثبوت دیا۔ وہ پاکستانیات کے بھی عالم ہیں۔ پاکستان کی تاریخ اور مسائل پر انھوں نے اچھے مطالعے پیش کیے۔ قریشی صاحب ایک خوش گو شاعر بھی ہیں، اپنی علالت کو انھوں نے بے کاری کا وقفہ نہیں بننے دیا۔ بلکہ اپنے تاثرات کو شعر کے قالب میں ڈھالتے رہے۔ اردو کے علاوہ فارسی زبان و ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کی تحریریں اس پر شاہد ہیں۔''

ڈاکٹر وحید قریشی اردو ادب کے ان اولین نقادوں میں سے تھے جنھوں نے نفسیات کو ادب میں بڑی کامیابی سے استعمال کیا اور ادبی عقائد کی منہاج تبدیل کر دی۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے انھیں انگریزی کے مشہور نقاد آئی، اے، رچرڈز سے متاثر قرار دیا ''جو تاثراتی تنقید کے خلاف تھا اور ادب میں تعین قدر کو ایک سائنسی شکل دینا چاہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ ادب کا مقصد قاری کے ذہن میں متوازن نفسیاتی کیفیت پیدا کرنا ہے''۔ ان کی رائے میں ''قریشی صاحب بھی وہی کچھ اردو میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو رچرڈز نے انگریزی میں کیا ہے۔'' اس ضمن میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید میں نفسیات عقبی دیار کی حیثیت رکھتی ہے۔

انھوں نے فرائیڈ کو حوالہ بنائے بغیر فن پارے سے شخصیت کو دریافت کرنے کی کاوش کی۔ ان کے ہاں علامتوں اور استعاروں کی تجزیہ کاری کا عمل چنداں اہم نہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے نفسیات کو اپنا وژن (Vision) وسیع کرنے کے لیے استعمال کیا۔ ایک عام انسان تو حقیقت کی ایک سطح تک ہی رسائی حاصل کر سکتا ہے اور یہ ظاہر کی سطح ہے جو باصرہ کے سامنے ہے اور جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے نفسیاتی وژن کی معاونت سے انسان کے داخل کے جزیروں تک رسائی حاصل کی اور ایک کشادہ نقطۂ نظر کو بروئے کار لا کر ایسے نتائج نکالے جو پہلے عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے لیکن اب سامنے آئے تو داخلی انکشاف پر شور بے جا بپا ہو گیا۔ انھوں نے فرائیڈ اور ایڈلر کے علاوہ ژونگ کے نظریات سے بھی پورا استفادہ کیا۔ چناں چہ وہ جب ادب اور تاریخ کے مختلف ادوار کا تجزیہ کرتے اور اصناف ادب کی داخلی ماہیت کو منکشف کرتے ہیں تو ان کی تنقید میں اجتماعی لاشعور کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے۔ ''سرسید احمد خان کے عہد کا تجزیہ''۔ ''اردو میں مزاح نگاری کی سماجی اہمیت''۔ ''پاکستانی قومیت کی تشکیل نو''۔ ''پنجابی اور اردو کے لسانی اور تہذیبی رابطے'' اور ''پاکستان میں اردو ادب، فنون لطیفہ اور اسلام'' ان کے چند ایسے مقالات ہیں جن میں انھوں نے ملک، قوم، ادب اور ادیب کے اجتماعی لاشعور سے ربط قائم کیا اور ایسے نتائج اخذ کیے جن میں ماضی کی دھڑکن بھی موجود ہے اور حال کا آہنگ بھی سنائی دیتا ہے۔ ان کا یہ طریقہ اتنا غیر روایتی ہے کہ یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید انھوں نے نفسیات سے استفادہ نہیں کیا لیکن درحقیقت نفسیات کا تمام اثر و عمل ان کی تنقید میں موجود ہوتا ہے اور اس تاثر کی وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف نفسیات دانوں کی دانش سے اور ان کے نفسیاتی نظریات سے بالواسطہ طور پر استفادہ کرتے ہیں لیکن قاری کو مرعوب کرنے کے لیے ان کے ناموں اور طویل حوالوں کی تکرار نہیں کرتے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی اپنے پسندیدہ موضوعات پر کتابوں کا مطالعہ اس انداز میں کرتے تھے کہ مصنف کے مطالب و معانی ان کے دل پر نقش ہوتے چلے جاتے، اور جب اس موضوع پر خود اپنا مقالہ رقم کرنے لگتے تو حوالے کی کتابیں تلاش کرنے کے بجائے اپنے حافظے میں محفوظ ان نقوش کو ہی استعمال میں لاتے۔ تاہم انھوں نے ادب کی اخلاقیات کو ہمیشہ ملحوظِ نظر رکھا اور جن مصنفین سے استفادہ کیا ان کا حق بھی ادا کیا۔ یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کسی ادیب کا قد چھوٹا کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن انھوں نے چھوٹے سروں پر بڑے عمامے رکھنے سے بھی گریز کیا، تنقید کو تقریظ نہ بننے دیا، اور جستجوئے صداقت کو ہمیشہ فوقیت دی۔ میرا خیال ہے کہ ان کی اس روش کو قبول عام حاصل نہیں تھا۔ بہت سے ادبا کرام ان کی مخالفت بلکہ دشمنی پر اتر آئے۔ شاید ''ادبی دنیا'' کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد واحد مدیر تھے جو ڈاکٹر وحید قریشی کے مضامین نمایاں طور پر چھاپتے تھے۔ میں اس زمانے میں ادب کا معمولی قاری تھا اور ڈاکٹر صاحب کے مضامین نہ صرف تلاش کر کے پڑھتا بلکہ ان کی جرأت مندی کا پختہ نقش بھی میرے دل میں موجود تھا۔ میں اس زمانے میں لاہور سے بہت دور میانوالی کے صحراؤں میں ملازمت کی خاک پھانک رہا تھا۔ اس لیے ان سے کبھی ملاقات کا موقع پیدا نہ ہو سکا۔

محکمہ آبپاشی میں انجینئرنگ کی ملازمت اختیار کرنے کی وجہ سے میری کالج کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ اس زمانے میں یونیورسٹی پنجاب کے قواعد و ضوابط کے تحت صرف سکولوں کے اساتذہ کو پرائیویٹ طور پر گریجوایشن کرنے کی اجازت تھی۔ عام طلبہ کو پہلے منشی فاضل یا ادیب فاضل کرنا لازمی تھا۔ پھر بی اے تک کا راستہ کھل جاتا تھا۔ لیکن دوسری طرف صرف انگریزی کا امتحان دے کر

اس طرح بی اے کی ڈگری لینے والوں کو تضحیک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور انھیں ''وایا مٹھنڈہ گریجوایٹ'' موسوم کیا جاتا تھا۔ میں نے ''وایا مٹھنڈہ'' بی اے تو کر لیا لیکن آگے ایم اے کا راستہ پھر بند تھا۔ پروفیسر حمید احمد خان پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو انھوں نے ایم اے کرنے کے دروازے سب پر کھول دیے۔ میں نے اس امتحان میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت میں شوقیہ شرکت کی اور قسمت کی خوبی دیکھیے کہ میں اس امتحان میں اول آ گیا۔ کانووکیشن پر ڈگری لینے کے لیے لاہور آیا تو ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقات ہوئی اور یہیں معلوم ہوا کہ وہ میرے غائبانہ محسن تھے۔ اوری اینٹل کالج کے ایک نامور استاد ادب چاہتے تھے کہ مجھ سے کم نمبر لینے والے یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو بلا استحقاق زیادہ نمبر دے کر اول قرار دے دیا جائے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس بد دیانتی کے خلاف سدِ سکندری بن گئے۔ ان کا موقف تھا کہ ایک پرائیویٹ امیدوار نے زیادہ نمبر لے کر اول آنے کا اعزاز حاصل کیا ہے تو اس کا حق نہ چھینا جائے۔ چناں چہ میری اولیت قائم رہی اور مجھے دو گولڈ میڈل بھی عطا کیے گئے۔ پرائیویٹ طلبہ میں میرا ریکارڈ تا حال قائم ہے۔ مجھے اس واقعے کا علم ہوا تو ڈاکٹر وحید قریشی کی عزت میرے دل میں ہزار چند ہوگئی اور ان سے نیاز مندی قائم ہوئی تو ان کے احسانات کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ وہ میرے ادبی شوق کو فزوں تر کرنے میں معاون بنتے چلے گئے۔ اس ضمن میں یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ میں نے ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے موضوع کو پی ایچ ڈی کے لیے پیش کیا تو صدر شعبہ اردو سید وقار عظیم نے اسے مسترد کر دیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی اس عہدے پر فائز ہوئے تو انھوں نے اس موضوع کو تو قبول کر لیا لیکن میرا خاکہ ان کے کاغذات میں پانچ مرتبہ گم ہو جاتا رہا۔ ڈاکٹر وحید قریشی صدر شعبہ اردو بنے تو انھوں نے دفتر سے یہ خاکہ تلاش کروایا اور مجھے مقالہ لکھنے کی منظوری دلا دی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ سلوک میرے ساتھ ہی روا نہیں رکھا گیا تھا بلکہ انور محمود خالد، ریاض احمد ریاض، رفیع الدین ہاشمی، رشید امجد اور ریاض مجید کے پی ایچ ڈی کے خاکوں کی منظوری میں بھی عبادت بریلوی صاحب رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اب مجھے یہ لکھتے ہوئے بھی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اس علمی اور تحقیقی کام میں ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی مجھے اپنی گراں قدر رہنمائی سے نوازا۔ اپنی ذاتی لائبریری سے بہت سی قیمتی اور نایاب کتابیں مجھے سرگودھا لے جانے کی اجازت دی اور یہ قیمتی مشورہ بھی دیا کہ اس کام کے دوران اخبارات میں کالم نگاری، رسائل میں مضمون نویسی، حتیٰ کہ دوستوں کو خطوط لکھنا بھی موقوف کر دوں اور اپنی ساری توجہ اور تمام قوت اور وقت اس مقالے پر صرف کر دوں۔ ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے بیرونی ممتحنین ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی تھے۔ زبانی امتحان سید عبداللہ صاحب نے لیا۔ اس مقالے پر مجھے بے پناہ داد ملی اور جب یہ کتاب چھپی تو اسے ''ہجرہ قومی ایوارڈ'' اس وقت کے صدر پاکستان فاروق لغاری صاحب نے دیا۔ میں ڈاکٹر وحید قریشی کے اس احسان کو بھی بھول نہیں سکتا کہ وہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین بنے تو انھوں نے ''اردو ادب میں سفرنامہ'' کے موضوع پر کتاب لکھنے کا فریضہ مجھے سونپا، اور اس کی تکمیل پر اشاعت کا اہتمام مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے کیا۔ جب کتاب شائع ہوگئی تو کہنے لگے کہ ''یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ آپ کو یہ موضوع دیتے وقت یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ ''اردو ادب کی تحریکیں'' کی طرح آپ کو اولیت کا ایک اور اعزاز حاصل ہو جائے۔'' میری زندگی کی یہ چند غیر معمولی مسرتیں ہیں جو مجھے ڈاکٹر وحید قریشی نے عطا کیں۔ ان سے ملاقات نہ ہوتی تو میں ان سے محروم رہتا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کو اپنی پسند کے موضوعات پر اچھی کتابیں حاصل کرنے اور اپنے کتب خانے میں محفوظ کرنے کا شوق بھی تھا جس کی پرورش وہ عشق کے جذبے سے کر رہے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں میرا تبادلہ لاہور میں ہو گیا اور میں نے اقبال ٹاؤن میں اپنا پانچ مرلے کا مکان تعمیر کر لیا تو ڈاکٹر صاحب سے جو سمن آباد میں مقیم تھے، ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ جب بھی جاتا تو دیکھتا کہ میز پر نئی کتابیں پڑی ہوتیں۔ اپنے گھر کی دوسری منزل کو انھوں نے کتب خانے کی صورت دے رکھی تھی جس کی وسعت کتابوں کے ذخیرے کے سامنے محدود ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن کتابوں کی خریداری میں ڈاکٹر صاحب نے کبھی کمی نہ آنے دی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی دعوت پر ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ایک دفعہ مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ انتظامیہ نے ہم تینوں کو ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔ یہ ہوٹل پرانی دہلی کے اردو بازار کے بالکل قریب تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی ہر شام کچھ وقت کتابوں کی خریداری کے لیے نکالتے اور اکیلے اردو بازار نکل جاتے۔ ان کی توجہ کا مرکز پرانی کتابیں فروخت کرنے والوں کی دکانیں تھیں، واپس آتے تو کتابوں سے لدے پھندے ہوتے اور اپنی خوش قسمتی پر فخر کرتے کہ انھیں اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی بعض نایاب کتابوں کے پہلے ایڈیشن دستیاب ہو گئے تھے۔ میری دلچسپی ان کتابوں کے صاف ستھرے نئے ایڈیشنوں میں تھی لیکن ڈاکٹر صاحب ہر کرم خوردہ کتاب کو اٹھاتے اور پھر اس کی اور مصنف کی تاریخ اور محاسن بیان کرنے لگتے۔ دہلی سے واپسی ہوئی تو ان کی کتابوں کا وزن دیگر سامان سے زیادہ تھا۔ اور پاکستان لانے کے لیے اضافی کسٹم ڈیوٹی ادا کرنی پڑی اور وہ اپنی بیٹی کے لیے تحفہ بھی خرید نہ سکے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن کسی دوست نے آ کر بتایا کہ لاہور کے آثارِ قدیمہ پر عبداللہ چغتائی صاحب کی ایک کتاب جو ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکی تھی، اردو بازار کے ایک ناشر نے چغتائی صاحب کی وفات کے بعد چھاپ دی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بتایا کہ عبداللہ چغتائی اپنی اس کتاب کی جتنی رائلٹی مانگتے تھے، ناشر اس کا دسواں حصہ بھی دینے پر تیار نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب اشاعت سے محروم رہ گئی۔ بددیانت ناشر نے مسودہ اپنے پاس رکھ لیا اور عبداللہ چغتائی سے بھاؤ تاؤ کرتا رہا۔ اسی دوران چغتائی صاحب خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ناشر نے ان کا کفن میلا ہونے سے پہلے یہ کتاب چھاپ دی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اشاعت کی خبر سنی تو غصے میں آ گئے اور ناشر کی خبر لینے کے لیے اردو بازار پہنچ گئے۔ کتاب دیکھی تو ان کا سارا غصہ موقوف ہو گیا۔ ناشر نے کتاب اعلیٰ آرٹ پیپر پر، خوبصورت بے داغ کتابت میں مصور چھاپی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی خوشی چھپا نہ سکے لیکن ملال سے کہا:

''کاش! یہ کتاب عبداللہ چغتائی کی زندگی میں شائع ہو جاتی۔''

انھوں نے ناشر کو نقد قیمت ادا کی اور یہ کتاب اپنے کتب خانے میں سجانے کے لیے لے آئے، راستے میں کہتے جاتے تھے:

''عبداللہ چغتائی آج عقبیٰ میں ضرور خوش ہوں گے کہ ان کا فیضِ عام وفات کے بعد بھی جاری ہے۔''

لیکن ملال بھی کرتے جاتے تھے کہ:

''کتابوں کے اس تاجر نے ایک محنت کش محقق کی رائلٹی ادا نہیں کی۔ اس کا حق مار لیا ہے۔''

ڈاکٹر وحید قریشی کو اپنا کتب خانہ محفوظ رکھنے میں گہری دلچسپی تھی اور وہ بالعموم طلبہ کو کتابیں مستعار دینے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن جب انھیں طالب علم کی طلب صادق کا یقین ہو جاتا تو پوری معاونت کرتے تھے۔ اپنے تحقیقی کام کے دوران جب میں نے ان

کے کتب خانے سے استفادے کا سلسلہ شروع کیا تو دیکھا کہ کتابیں مستعار دیتے وقت قریشی صاحب فہرست نہیں بناتے تھے، لیکن جب کتابیں واپس کرنے کا دور آیا تو حیرت ہوئی کہ انھوں نے سب کتابوں کے نام ایک رجسٹر میں درج کر رکھے تھے اور کتابیں واپس کیں تو ان کی پوری چیکنگ کی اور مجھے اس داد سے نوازا کہ میں نے ان کی کتابیں پوری احتیاط سے استعمال کی تھیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے ذاتی کتب خانے میں مختلف موضوعات کی تیس چالیس ہزار کتابیں موجود تھیں، ان میں کئی نادر مخطوطات بھی تھے۔ انھیں کتابوں کے تمام اور بالخصوص پہلا ایڈیشن حاصل کرنے میں گہری دلچسپی تھی۔ اخبارات کے اہم تراشے اور لیڈروں کے بیانات کی فائلیں الگ بنا رکھی تھیں۔ ادیبوں کے خطوط جمع کرنے کا بھی انھیں شوق تھا۔ کسی ادیب کی کوئی پرچی اہم نظر آتی تو اسے بھی سنبھال کر رکھتے تھے۔ اس پر مستزاد نامور ادیبوں کے معرکوں اور مجادلوں کی فائلیں بھی موجود تھیں۔ مجھے مشفق خواجہ صاحب نے بتایا تھا کہ حکیم محمد سعید (ہمدرد دواخانہ کراچی) کی خواہش تھی کہ وحید قریشی یہ کتب خانہ ان کے ادارے کے پاس فروخت کر دیں۔ انھوں نے ایک خطیر رقم کی پیش کش بھی کی تھی، پھر جنوبی پنجاب کی نجی لائبریری نے زیادہ ''اعزازیے'' پر یہ لائبریری حاصل کرنی چاہی، لیکن ڈاکٹر وحید قریشی اپنے کتب خانے سے مفارقت پر آمادہ نہ ہوئے۔ کہتے تھے کہ یہ لائبریری نہیں، زندہ مصنفین کی انجمن ہے جن سے میں جب چاہوں ملاقات کر سکتا ہوں۔ یہ کتابیں میرے ساتھ باتیں کرتی ہیں۔''

لیکن پھر عمر ضعیفی کے ''تحفے'' نازل ہونے لگے۔ مختلف اقسام کی علالتوں نے انھیں آن گھیرا۔ سمن آباد والا مکان چھوڑ کر وہ ملتان روڈ پر ایک دور افتادہ نئی آبادی میں منتقل ہو گئے۔ پوری لائبریری پہلے ڈاکٹر طارق عزیز کے ہاں پڑی رہی، پھر نئے مکان میں پہنچائی گئی۔ اور پھر ایک روز یہ متاع خاص جو انھیں دل و جان سے عزیز تھی گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کی نذر کر دی کہ اس سے اہل تحقیق استفادہ کر سکیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی ایک لمبے عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے۔ ہر ماہ ادویات کے لیے زر کثیر کی ضرورت لاحق رہتی تھی لیکن وہ بڑے اطمینان سے کہتے:

''لائبریری فروخت کرنے کے خیال سے ہی مجھے سوہان روح ہو جاتا ہے۔''

پنجاب یونیورسٹی میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی کو ''مقتدرہ قومی زبان'' کا صدر نشین مقرر کیا گیا۔ ''بزم اقبال'' لاہور کے علاوہ انھوں نے اقبال اکیڈمی کے ناظم کی خدمات بھی انجام دیں۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کے ساتھ ان کی وابستگی زندگی کے آخری لمحات تک رہی۔ اول الذکر تین اداروں میں انھیں کڑے انتظامی امور بھی انجام دینے پڑتے تھے، میں ان تمام انتظامی حیثیتوں میں ڈاکٹر وحید قریشی کا دور کا شناسا ہوں۔ صرف مغربی پاکستان اردو اکیڈمی میں مجھے ان کے ساتھ خزانہ دار کی اعزازی خدمات انجام دینے کا اعزاز حاصل ہوا۔ جب کہ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی یہ خدمت بلا معاوضہ ہی ادا کی۔ میرا دور کا مشاہدہ یہ ہے کہ وحید قریشی بہت کڑے اور کڑوے منتظم تھے۔ وہ دفتری نظام کو قواعد و ضوابط کے عین مطابق چلاتے تھے اور قانونی ضابطوں پر خود سختی سے عمل کرتے تھے۔ جب وہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشین تھے تو لوگوں کو شدید شکایت تھی کہ ڈاکٹر صاحب معینہ وقت سے دو تین منٹ پہلے آکر اپنی نشست پر بیٹھ جاتے اور نصف گھنٹے کے بعد حاضری کا رجسٹر اپنے پاس منگوا لیتے تھے۔ شام کو دیر تک بیٹھتے لیکن دفتری اوقات کے بعد عملہ رخصت ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی دوسری بڑی خوبی مالی امور میں ان کی دیانت داری

تھی۔ کرپشن کے اس دور میں انھوں نے اپنے ادارے میں کسی کو ایک ٹیڈی پیسے کی خیانت نہیں کرنے دی۔ تاہم اگر کچھ لوگ انھیں بھی جل دے گئے ہوں تو یہ ان لوگوں کی عیاری ہے۔ تیسری بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب اخلاقی ضابطوں کی پابندی کی ہر شخص سے توقع کرتے تھے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ایک ادارے میں ان کے دفتر کا ایک کلرک اخلاقی بے راہ روی کی طرف مائل تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اس کی جواب طلبی کی اور اس کے "اعتراف گناہ" کے بعد اسے ادارے سے فارغ کر دیا۔ میں نے ان کے خلاف پمفلٹوں کی مہم چلتی بھی دیکھی ہے۔ ان کے خلاف اس قسم کی مہم چلانے والے حلف اٹھا کر بری الذمہ ہونے اور سازش میں عدم شرکت کا یقین دلاتے اور پھر اپنی معصومیت ثابت کرنے کے لیے گشتی مراسلے چھاپنے لگتے۔ ایک سازش میں تو ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ مشفق خواجہ صاحب کو بھی لپیٹنے کی کوشش کی گئی۔ ایک دفعہ ایک اخبار نویس ان کے پاس "بدعنوانیوں" کا پلندہ لے کر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو چائے پلائی اور مشورہ دیا کہ آپ یہ سب الزامات اپنے اخبار میں چھاپ دیجیے لیکن یاد رکھیے کہ انھیں ثابت کرنے کے لیے آپ کو عدالت میں بھی حاضر ہونا پڑے گا۔" اس پر وہ صحافی رفو چکر ہو گئے۔ ملک حسن اختر نے اپنی "تاریخ ادب اردو" میں ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید کو جارحانہ اور بے رحمانہ قرار دیا ہے۔ تنقید کا عمل ان کی پوری زندگی پر حاوی ہے اور دیکھا جائے تو ان کی دفتری اور انتظامی صلاحیتوں کی پرورش بھی دیانتداری کی "جراحت" اور صداقت کی "بے رحمی" سے ہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی ادبی شخصیت پر تحقیق اور تنقید حاوی ہے، لیکن ان کے باطن میں ایک خوش فکر شاعر بھی موجود تھا۔ ان کی شاعری کی کتاب "نقد جاں" کسی ایک صنف سخن کی شعری تصنیف نہیں بلکہ اس میں ہر صنف کے چند ایک عمدہ نمونے جمع کر دیے گئے ہیں اور یہ اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا تخلیقی الاؤ کسی ایک تنگنائے میں سما نہیں سکتا۔ قطعات میں ان کا موضوع دیہات کی فطری سادگی اور قدرتی مناظر ہیں۔ خاموش چراگاہوں، شام کی ویرانیوں میں سرسوں کے حسین کھیتوں کے ساتھ ساتھ ترنجن کی افسردہ اور رعنا لڑکیاں اور مستی اور شوق میں ڈھلتے آنچل نظر آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ:

"جام خود بندی صہبا سے چھلک جاتے ہیں"

قطعات کا یہ جمالیاتی رنگ غزل میں بھی سامنے آتا ہے اور یہاں جذبے کی حدت میں پگھل جانے کے باوجود انھوں نے عشق کی کلاسیکی عظمت برقرار رکھنے کی سعی کی ہے۔ مناظر قدرت سے ان پر سرخوشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن درون دل غم کی ایک دائمی کیفیت بھی موجود نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نظموں میں ذات کے استعارے سے کائنات کی شاعری کی ہے۔ انھوں نے ہیئتی پابندیوں کو قبول کرنے کے بجائے جذبے کی شدت سے راہنمائی حاصل کی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پابند نظموں کے پہلو بہ پہلو بہت سی آزاد نظمیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ ان کی اکثر نظموں میں مجھے نغمگی کی ایک خاص کیفیت نظر آتی ہے۔ بطن سطر میں جذبے کی شدت زیادہ ہے اور اکثر و بیشتر عنوانی زاویے سے خود سپردگی کا انداز نمایاں ہوتا ہے۔ یہ مزاج گیت کے زیادہ قریب ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری کا دوسرا مجموعہ "الواح" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کا پس منظر لکھنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا۔ میرا احساس اس وقت یہ تھا کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی شاعری کو پورا وقت نہیں دیا۔ تاہم جب وہ طویل علالت کا شکار ہو گئے تو انھوں نے شاعری پر زیادہ توجہ دی اور غزل اور دوہا کی اصناف میں تخلیقات کے انبار لگا دیے۔ اس دور میں وہ ٹیلی فون پر ڈاکٹر

انور محمود خالد صاحب کو غزلیں املا کروا دیتے اور وہ انھیں چھپنے کے لیے الحمراء کو بھیج دیتے اور شاہد علی خان انھیں بڑے اہتمام سے نمایاں طور پر شائع کرتے۔ اس دور کی غزلوں میں سیاست کی گرم بازاری نمایاں نظر آتی ہے۔ قومی مسائل پر رمزیہ انداز میں ردعمل بھی نمایاں ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب طنز کے تیز نشتر چلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں:

زمانہ سارے دفینے اگلنے والا ہے
مزاج شہرِ خموشاں بدلنے والا ہے
چلو ستارۂ جرأت عطا کریں اس کو
سنا ہے، شہر سے قاتل گزرنے والا ہے
خرد کو وعدۂ فردا کا اعتبار نہیں
دلوں میں آگ کا شعلہ مچلنے والا ہے

زندگی سوزِ یقیں سے خالی
شہر کا شہر، مکیں سے خالی
کھوکھلے نعروں سے دنیا آباد
سیپیاں درِ ثمیں سے خالی
تیری امت کو ہوس دنیا کی
اہلِ دیں، جذبۂ دیں سے خالی

ڈاکٹر وحید قریشی کو مبدائے فیاض نے مزاج کی لطیف حس بڑی فراوانی سے عطا کی تھی۔ وہ دوسروں کی بات بڑے غور سے سنتے اور جہاں موقع ملتا اپنا تاثر ایک چست فقرے سے یوں پیش کرتے کہ سننے والے قہقہہ بار ہو جاتے۔ انھیں اچھا جملہ برموقع سوجھتا تھا اور ان کے مزاج کا تیر ہمیشہ نشانے پر بیٹھتا تھا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے درست لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو جملہ ضائع نہیں کرتے، دوست ضائع کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ ان کا مزاح شستہ اور شائستہ ہوتا تھا اور وہ رعایت لفظی سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کے جملے میں گہری طنز در آتی اور اس سے تمسخر کا زاویہ بھی ابھر آتا۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی ذات پر دوسروں کو جملہ کسنے کا پورا موقع دیتے۔ اور اچھے جملے پر دل کھول کر قہقہہ لگاتے۔ انھیں احساس تھا کہ ان کا فربہ جسم دوسروں کے لیے مزاح خیز ہے لیکن جب ان کا غیر معمولی موٹاپا مزاح کی زد میں آ جاتا تو اس کا برا نہیں مناتے تھے۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر وحید قریشی ویسپا سکوٹر پر کالج تشریف لایا کرتے تھے، اور سکوٹر پر بیٹھے ہوئے عجب بے ڈھنگے لگتے تھے۔ بچے دیکھتے تو تالیاں بجانے لگتے۔ ایک دن سکوٹر کے انجن سے ایک لمبی آواز نکلی اور سکوٹر رک گیا۔ قریب سے گزرتے ہوئے ان کے ایک دوست نے فی البدیہہ رائے دی ''ڈاکٹر صاحب! سکوٹر خراب نہیں ہوا، اوورلوڈنگ (Over Loading) کی فریاد کر رہا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے کار خریدی تو اسے خود چلاتے تھے۔ ڈرائیونگ

سیٹ کا پہیا ان کے جسمانی وزن سے پچک جاتا اور کار غیر متوازن ہو جاتی۔ ایک مکینک نے ازرہِ مذاق مشورہ دیا کہ اس طرف دو پہیے لگوا لیجیے، گاڑی متوازن ہو جائے گی۔ وحید قریشی سن کر مسکرا دیے۔ شاید کچھ لوگوں کو اب بھی یاد ہو کہ ڈاکٹر صاحب روزنامہ ''جنگ'' میں ''میر جملہ لاہوری'' کے نام سے مزاحیہ کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ معروف محقق محمد عالم مختار حق صاحب نے ایک دن مجھے بتایا کہ میر جملہ لاہوری کے تمام کالم ان کے ادبی ذخیرے میں محفوظ ہیں اور وہ انھیں اکثر پڑھ کر ان سے مسرت کشید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مزاح کا ہدف بالعموم نامور ادبا ہوتے تھے اور جملے کا عنوان مزاح کا اشارہ نما بن جاتا تو اس کا متن پس منظر کو روشن کر دیتا۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

ادب کا گورو گھنٹال

''ادبی چیلوں نے منیر نیازی کو پہلے گورو بنایا، پھر ان کا بت بنا کر پوجا کرنے لگے۔ منیر نیازی سنجیدہ ہو گئے اور پیغمبری کا دعویٰ کر بیٹھے۔ انجام کار وہ پیغمبر بن سکے نہ گورو۔ صرف گورو گھنٹال ہو کر رہ گئے۔''

تازہ مشغلہ

''سنا ہے پروفیسر محمد عثمان نے اخبار بینی ترک کر دی ہے۔ آج کل صرف ضرورت رشتہ کا کالم پڑھتے ہیں۔''

حفاظت خود اختیاری

''حفاظت خود اختیاری کے طور پر بیدار سرمدی نے آیندہ ''میک اپ'' کے بغیر دفتر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

ادبی نوادر کا ڈیپ فریزر

''ادبی نوادر کے ڈیپ فریزر (Deep Freezer) مشفق خواجہ نے تخلیقی سرگرمیوں کے لیے ''تخلیقی ادب'' شائع کیا ہے۔ وہ آج کل غیر تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور ''بازیافت'' کے عنوان سے ایک تحقیقی رسالہ شائع کر رہے ہیں۔''

اٹوٹ انگ

''شوکت صدیقی نے بداندیشوں کی مذمت کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ اور امجد اسلام امجد مل کر ڈرامے لکھتے رہیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔''

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی ذات کو بھی نہیں بخشا۔ حسب ذیل جملہ ان کے اپنے بارے میں ہے:

ہیوی ویٹ نقاد کی کتابیں

''اردو کے ہیوی ویٹ (Heavy Weight) نقاد ڈاکٹر وحید قریشی کی چار کتابیں عنقریب مارکیٹ میں آ رہی ہیں۔''

میں نے ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک سیاح کی حیثیت میں ان کے سفرنامہ ''چین کی حقیقتیں اور افسانے'' میں دیکھا جو رسالہ ''اردو ڈائجسٹ'' میں قسط وار چھپا تھا۔ اس سفرنامے کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر وحید قریشی۔۔۔ ایک مورخ۔۔۔ ایک نقاد۔۔۔ اور

ایک ادیب کی تین صورتوں میں مظاہر، مناظر، اشیا اور شخصیات کو دیکھ رہے ہیں۔ چین کا قدیم تاریخی ماضی ایک کتاب کی صورت میں ان کی بغل میں ہے۔ ان کے باطن کا مورخ معاشرتی اور تہذیبی سوالات پیدا کرتا ہے۔ نقاد مشاہدات کا تجزیہ کرتا ہے اور ادیب ان سب کو اپنے شگفتہ اسلوب میں سفرنامے کا جز و بنا دیتا ہے۔ سیاح وحید قریشی کا ہر سوال ایک خاموش سناٹا ہے لیکن جب منظر حقیقت کشا ہوتا ہے تو شیشہ باز فرنگ بھی حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔

سفرنامہ ''چین کی حقیقتیں اور افسانے'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے ٹیکنیک کا یہ منفرد تجربہ بھی کیا ہے کہ پورے سفرنامے کو زمانی قیود سے آزاد کر دیا ہے اور اسے ایک ایسے خواب کی صورت دے دی ہے جو صرف ۲۴ گھنٹوں میں مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ سفرنامہ دیکھی ہوئی حقیقت کو تخیلہ کی آنکھ سے بازیافت کرتا ہے اور شعور کی متحرک رو سے گزار کر ایک دل نشین رپورتاژ کی صورت دے دیتا ہے۔ چناں چہ جدید سفرنامے میں جو نئی امتزاجی صورت رپورتاژ نے پیدا کی ہے اس کی ابتدا وحید قریشی کے اس سفرنامے سے ہوئی۔ البتہ ڈاکٹر صاحب نے یہ احتیاط کی کہ مشاہدہ حقیقت سے گریز اختیار نہ کرے اور سفرنامے کی صداقت مجروح نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی شگفتہ نثر نے سفرنامے کی دل آویزی میں انشائی کیفیات پیدا کر دی ہیں اور ۱۹۶۶ء کا چین ہمارے سامنے اپنے پورے تناظر کو آشکار کر دیتا ہے۔ زندگی کے آخری دور میں ڈاکٹر وحید قریشی کے مزاج میں ایک خاص نوع کی بے نیازی پیدا ہو گئی تھی۔ اس سفرنامے کی کتابی صورت میں اشاعت اس بے نیازی کی نذر ہو گئی۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی ادبی زندگی کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عہد کے ادیبوں، دانشوروں، دوستوں حتیٰ کہ طالب علموں کے کام کو نمایاں کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہے تھے۔ اس زاویے سے ان کی ادبی صحافت بھی ان کے عملی کردار کا ایک اہم زاویہ ہے۔ ان کی ادبی زندگی کم و بیش ساٹھ سال پر محیط ہے۔ اس عرصے میں انھیں اول درجے کے متعدد ادبی رسائل کی ادارت کے فرائض ادا کرنے کے مواقع ملے اور تاریخ شاہد ہے کہ ان رسائل کی ادبی زندگی میں ڈاکٹر وحید قریشی کے دور ادارت کو ہی ''زریں دور'' سے تعبیر کیا گیا۔ اس کی ایک مثال مجلس ترقی ادب لاہور کا سہ ماہی رسالہ ''صحیفہ'' جس کے مدیر اول سید عابد علی عابد تھے۔ انھوں نے اس رسالے کی تخلیقی جہت کو زیادہ اہمیت دی جب کہ مجلس کے آئین کی رو سے یہ رسالہ تحقیقی مضامین کی اشاعت کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ وحید قریشی ''صحیفہ'' کے مدیر مقرر ہوئے تو انھوں نے آئین کی شرائط کے مطابق اس کا تحقیقی مزاج بحال کر دیا۔ ان کے دور ادارت میں ''صحیفہ'' نے نامور شخصیات پر ''خاص نمبر'' شائع کرنے کی روایت کو فروغ دیا۔ چناں چہ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۳ء تک کے دور ادارت میں انھوں نے ۱۲ خاص نمبر شائع کیے۔ ان میں غالب نمبر (۵ حصے)۔ اقبال نمبر (۲ حصے)۔ دس سالہ قومی ترقی نمبر۔ ادبیات فارسی نمبر اور مولانا الطاف حسین حالی نمبر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کے عہد ادارت میں ''صحیفہ'' کے پیش رو مدیر جناب سید عابد علی عابد اور ناظم مجلس سید امتیاز علی تاج پر بھی خاص نمبر پیش کیے گئے جو اب حوالے کی کتابیں شمار ہوتی ہیں۔ ان کی محنت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ صحیفہ کے لیے جو مضامین آتے تھے، انھیں خود پڑھتے، بعض کی تصحیح کرتے اور متعدد مضامین کو غیر ضروری مواد سے پاک کر کے دوبارہ لکھتے۔ قاضی عبدالودود کے مضامین کو قابل فہم بنانے کے لیے ان کی کلید (Key) استعمال میں لاتے اور عبداللہ چغتائی کے مضامین کاتب کی سہولت کے لیے خود Rewrite کرتے تھے۔ بلاشبہ ان کا دور ادارت ''صحیفہ'' کا اہم دور ہے۔ اور ی

اینٹل کالج کی ملازمت کے دوران انھوں نے اوری اینٹل کالج میگزین کی ادارت ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک کی۔ایک نیا مجلّہ ''تحقیق'' کلیہ علوم اسلامیہ وشرقیہ کے زیر اہتمام ۱۹۷۷ء میں جاری کیا اور ۱۹۸۲ء تک اس کی ادارت کی۔مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین بنے تو ماہانہ ''اخبار اردو'' کی چار برس تک ادارت (۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۸ء) کی۔اقبال اکادمی پاکستان کا رسالہ ''اقبال ریویو'' کے متعدد شمارے ان کی ادارت میں شائع ہوئے۔بزم اقبال لاہور کے منتظم مقرر ہوئے تو اس ادارے کے رسالہ ''اقبال'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔قائداعظم لائبریری کے بورڈ آف گورنرز کے رکن جناب عنایت اللہ نے اس لائبریری کا نمایندہ رسالہ جاری کرنے کی تجویز منظور کرائی تو انھوں نے رسالہ ''مخزن'' کی ادارت کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی کو منتخب کیا۔ان کی ادارت میں ''مخزن'' کے ۱۸ شمارے شائع ہوئے جس کے تحقیقی مزاج کی تحسین پوری ادبی دنیا میں ہوتی رہی ہے۔اور اب ''مخزن'' کا ۱۹واں شمارہ شہزاد احمد صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اور یہ ڈاکٹر وحید قریشی کی ادبی خدمات کے اعتراف کے لیے مختص کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی زندگی اپنی شرائط پر بسر کی۔متعدد قسم کی بیماریوں کو انھوں نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے زیر کر رکھا تھا اور علالت کی تکلیف اور اپنی تنہائی کو ہمیشہ شکست دی۔وہ ذہنی طور پر کئی منصوبوں کو ترتیب دے رہے تھے لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ان کی وفات اردو ادب کے لیے ایک سانحہ ہے۔افسوس، اے وائے افسوس۔

طوفان اور شبنم

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر وحید قریشی کئی جہات پر مشتمل شخصیت کے حامل تھے۔ تحقیق، تنقید، شاعری، تدریس، ایڈمنسٹریشن، فوٹوگرافی، پرمزاح گفتگو، فقرہ بازی اور ان سب پر مستزاد ان کا عملی ہونا۔ میں نے اپنی کتاب ''اقبال کا ادبی نصب العین'' کا انتساب، یہ شعر لکھ کر ڈاکٹر وحید قریشی کے نام کیا تھا:

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اس شعر سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے متضاد خصائص بخوبی اجاگر ہو جاتے ہیں۔

میرا اور ڈاکٹر صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ نہ میں ان کا شاگرد تھا، نہ رفیق کار اور نہ ہی ماتحت۔ اس لیے ان سے برابری کی سطح پر ملتا تھا، یعنی صرف دوستی تھی۔ اسی لیے میں ان سے لبرٹی بھی لے لیتا تھا۔ لیکن یہ تب کی بات ہے جب تعلقات میں گرم جوشی کے ساتھ ساتھ بے تکلفی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ محقق ڈاکٹر وحید قریشی کا نام اور کام انھیں بارعب شخص بنا دیتا تھا لیکن قریب ہونے پر وہ خاصے مخولیہ ثابت ہوتے۔ تحقیق کا سخت چھلکا اتر جانے کے بعد اندر سے نرم ملائم شخص برآمد ہوتا۔ لاہور آنے کے بعد جب ان سے قربت اور بے تکلفی کا آغاز ہوا تو میں ان کا رازدار بن گیا، مجھے ادھر ادھر کی باتیں کر کے شر پھیلانے کی بیماری نہیں، اس لیے رازدار کے طور پر میں ایسا کنواں ہوں جس میں پتھر پھینک دیا جائے، بہت سے امور حتیٰ کہ گھریلو معاملات میں بھی وہ مجھ سے مشورے لیا کرتے تھے۔

میں جب ۱۹۶۲ء میں لیکچرر بن کر ملتان گیا تو صحیح معنوں میں تنقید اور افسانہ نگاری کی طرف توجہ دی۔ ان دنوں میں بہت فعال اور تیز قلم کار تھا۔ چناں چہ تین چار برس میں اتنے تنقیدی مقالات لکھ لیے کہ ایک کتاب تیار ہو سکے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سلام دعا تھی مگر اتنی نہیں کہ میں بے تکلفی سے انھیں تنقیدی کتاب کے دیباچہ کی فرمائش کر سکتا۔ بہرحال میں نے انھیں خط لکھا۔ انھوں نے مسودہ منگوا لیا اور ''نگاہ اور نقطے'' کا دیباچہ رقم کر دیا۔ دیباچہ روایتی قسم کا نہ تھا بلکہ نفسیاتی تنقید پر باضابطہ مقالہ تھا۔ جونیئر کی سرپرستی کے لحاظ سے یہ بہت بڑی بات تھی۔ خود ڈاکٹر صاحب کو بھی یہ دیباچہ بہت پسند تھا۔ چناں چہ انھوں نے دیباچہ بطور مقالہ ''ہمایوں'' دہلی میں بھی چھپوا دیا۔

۱۹۷۰ء میں جب لاہور آ گیا تو صحیح معنوں میں ڈاکٹر صاحب سے یاری شروع ہوئی۔ میں گورنمنٹ کالج سے نکلتا اور

اورینٹل کالج میں ڈاکٹر صاحب کے کمرا میں جا بیٹھتا، جہاں چائے ہوتی، احباب ہوتے، مسائل چھیڑے جاتے، گپ شپ اور فقرہ بازی، سبھی کچھ ہوتا۔

ڈاکٹر وحید قریشی مجلسی انسان تھے، حلقۂ احباب میں ان کے بلند آہنگ قہقہے گونجتے، ہدف متعین کیے بغیر فقرہ بازی سے چاند ماری ہوتی۔

جب لاہور سے روزنامہ ''جنگ'' کا اجرا ہوا تو حسن رضوی (مرحوم) اس کے ادبی صفحہ کا نگران تھا۔ حسن رضوی نے ادبی صفحہ کو بنانے سنوارنے کے لیے بہت محنت کی۔ ان دنوں جنگ کا ادبی ایڈیشن دو صفحات پر مشتمل تھا اور خوب تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ''میر جملہ لاہوری'' کے قلمی نام سے ادب اور ادبی شخصیات کے بارے میں طنزیہ کالم لکھنا شروع کیا، کالم کیا تھا بارہ مصالحہ کی چاٹ تھی، بعض اوقات دوستوں کو کالم سنا کر خود بھی ہنستے اور دوست بھی، یوں سمجھیے کہ یہ کالم چائے کے ساتھ پیسٹری کا کام کرتے تھے۔ ایسی ہی محفلوں سے اس فقرہ نے جنم لیا جو مدتوں تک لاہور کی ادبی محفلوں میں سنایا جاتا رہا۔

میرزا ادیب (مرحوم) سیدھے سجاؤ کے بے ضرر انسان تھے، طبعاً باطن بین (Interovert) اور مزاجاً قنوطی، پاؤں کی خرابی نے شخصیت پر منفی اثرات ڈالے تھے، میرزا ادیب کو صدارتی تمغا حسن کارکردگی ملا تو ادبی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا ہوا۔ میرزا ادیب اور دیگر حضرات ڈاکٹر صاحب کے کمرا میں بیٹھے تھے۔ حسب معمول میرزا صاحب گم صم، کچھ اداس اداس سے نظر آرہے تھے۔ کسی نے کہا میرزا صاحب! آپ کو اتنا بڑا اعزاز ملا ہے اور آپ پھر بھی اداس بیٹھے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فقرہ چست کیا ''دراصل یہ اس لیے اداس ہیں کہ اگلے برس یہ ایوارڈ کسی اور کو مل جائے گا۔''

میں یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ بالعموم باور کیا جاتا ہے کہ محقق خشک قسم کے مردم بیزار جانور کا نام ہے جو قلمی کتابوں پر پلتا ہے۔ پرانی کتابوں کی خاک چھانتا اور کتب خانوں کی دھول پھانکتا ہے اور بالآخر ایک دن دیمک بن کر کتاب کو چٹ کر جاتا ہے یا پھر کتاب اس کے لیے دیمک ثابت ہوتی ہے۔ الغرض محقق کا بھی چوب خشک منبر جیسا معاملہ ہوتا ہے نہ سوختنی نہ فروختنی!

ڈاکٹر وحید قریشی یبوست زدہ محقق نہ تھے۔ زندہ دل، باغ و بہار۔ یہ لکھ رہا ہوں اور دو اور ایسے محقق بھی یاد آرہے ہیں جو ڈاکٹر وحید قریشی کے مانند بذلہ سنج تھے میری مراد مشفق خواجہ (مرحوم) اور ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی) سے ہے۔ یہ دونوں بھی ایسے محقق ہیں جو شگفتہ اسلوبی کا فقرہ بازی سے رنگ چوکھا کرتے ہیں اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں ہی بہت اچھے فوٹو گرافر بھی ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی فوٹو گرافی کا زیادہ چرچا نہ ہوا لیکن انھیں فوٹو گرافی کا بہت شوق تھا۔ ڈاکٹر صاحب اورینٹل کالج میں بھی کیمرہ اپنے ساتھ رکھتے تھے جو دوست آیا اس کی تصویر بنا ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے میری کئی تصاویر بنائیں مگر ایک تصویر خصوصی تذکرہ چاہتی ہے۔ ہوا یہ کہ گرمی کی وجہ سے میں نے انارکلی سے پی کیپ خریدی اور پہنچ گیا ڈاکٹر صاحب کے کمرا میں۔ انھوں نے پہلے تو ٹوپی کا خوب مذاق اڑایا (اتنا کہ اس کے بعد میں نے ٹوپی نہ پہنی) اس کے بعد دراز سے کیمرہ نکالا، میری تصویر اتاری اور اس کی انلارج کاپی مجھے بھی دی۔ پی کیپ کی وجہ سے اس تصویر میں میں ذرا وکھری ٹائپ دا سلیم اختر نظر آرہا ہوں۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ فوٹو گرافی میں انھیں سب سے زیادہ کلوز اپ بنانے میں دلچسپی تھی، اس کوشش

کے ساتھ کہ چہرہ شخصیت نما ثابت ہو۔

فوٹوگرافی میں بھی ڈاکٹر وحید قریشی نے تحقیق سے کام لیا۔ یہ نہیں کہ کیمرا اٹھایا، کھٹ سے شٹر دبایا اور تصویر اتار لی، انھوں نے کیمروں اور فوٹوگرافی کے فن کے بارے میں کتب خریدیں اور ٹھیک ٹھاک مطالعہ کے بعد پروفیشنل سطح کی فوٹوگرافی کی۔ جس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب انھوں نے آسمانی بجلی کی تصویر دکھائی، بادلوں اور بارش میں، رات کو برق کی تصویر بنانا آسان نہیں۔ چناں چہ میرے استفسار پر کہ آپ نے یہ تصویر کیسے اتاری، انھوں نے تکنیک کے بارے میں لمبا چوڑا لیکچر دیا۔

چند تصویر بتاں کے برعکس ڈاکٹر صاحب کے گھر سے کثیر تعداد میں تصاویر ملیں گی، جن میں سے بعض قدیم اور مرحوم شخصیات کی تصاویر یقیناً اب تاریخی اہمیت کی حامل ثابت ہو سکتی ہیں اور نہیں تو صرف اسی وجہ سے کہ انھیں ڈاکٹر وحید قریشی نے اتارا ہے۔ اورینٹل کالج اور مقتدرہ قومی زبان (ڈاکٹر صاحب جس کے صدر نشین رہے تھے) تو اس ضمن میں شاید کچھ نہ کرسکیں لیکن گورنمنٹ کالج یونیورسٹی (جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنا کتب خانہ دیا تھا) ان کی تصاویر حاصل کر کے انھیں محفوظ کرسکتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ڈاکٹر خالد آفتاب وائس چانسلر ایسے معاملات میں پیسا خرچنے کو تیار رہتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی سادہ لباس اور سادہ خوراک تھے۔ بیشتر اہل علم و اہل قلم کو نوشہ بننے کا شوق نہیں ہوتا اس لیے کہ زندگی میں ان کی ترجیحات جداگانہ ہوتی ہیں، سو ڈاکٹر صاحب کو بھی چھیلا بننے کا شوق نہ تھا، ان کا اصلی تے وڈا شوق بلکہ Passion کتابیں تھیں اور اس ضمن میں خرچ کرتے وقت انھوں نے کبھی بھی ہاتھ نہ روکا۔ اردو، فارسی، انگریزی کی نایاب کتب کے علاوہ قلمی مسودات، مخطوطات، جرائد اور ہزاروں ریفرنس بکس۔ ذاتی کتب خانوں میں یقیناً ان کا کتب خانہ شاندار اور وقیع تھا۔ سمن آباد والے مکان کی دوسری منزل کے تمام کمرے ان کی کتابوں سے گویا چھلک رہے تھے۔ گھر میں مزید کتابیں رکھنے کی جگہ نہ تھی مگر اچھی کتاب خریدے بغیر رہ بھی نہ سکتے تھے۔

کتب کے مانند ان کے پاس پاکستان اور ہندوستان کے لاتعداد مشاہیر کے خطوط بھی محفوظ تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے بتایا کہ اگر کسی نے کوئی چٹ بھی مجھے بھیجی تو اسے میں نے ضائع نہ کیا بلکہ سنبھال کر رکھا۔۔۔ اور ایک محقق کی یہی خاصیت ہے کہ وہ کسی چیز کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ کیا پتا کل کو کون سی چیز بطور سند اور حوالہ کام آسکے۔ ایک مرتبہ کسی محفل میں کسی شخص کے تذکرہ کے سلسلہ میں یہ بتایا گیا کہ کسی زمانہ میں اس کا ایک ادیبہ سے بڑا زبردست افیئر چلا اور ان کی عشقیہ خط و کتابت ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس محفوظ ہے۔ میں نے جب اس بات کی تصدیق چاہی تو انھوں نے اقرار کیا کہ واقعی ان دونوں کے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اور محفوظ رہیں گے۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب میرے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ کے نگران تھے، جب میں پہلا باب انھیں دکھانے کے لیے لایا تو کہنے لگے مجھے معلوم ہے تم کام کرلو گے لہٰذا مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ہے کہ مقالہ کی تحریر کے دوران تمام سرگرمیاں بند کردو، ادبی تقریبات میں شرکت نہ کرو، اگر مقالہ لیٹ ہوجائے تو اچھا خاصا مسئلہ بن جاتا ہے۔

یہ بطور تعلّی نہیں لکھا بلکہ یہ بتانے کے لیے کہ ڈاکٹر صاحب کو مجھ پر کتنا اعتماد تھا۔

مقالہ کی تحریر کے دوران میں نے ان کی لائبریری سے خاصا استفادہ کیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل نہ جاسکتے تھے لہٰذا مجھے چابی دے دیتے، میں اپنی ضرورت کی کتابیں اٹھاتا اور پھر ایمانداری سے واپس کر دیتا۔ ایک مرتبہ انھوں نے بتایا کہ میں ہر کسی کو کتاب نہیں دیتا لیکن تم پر اعتبار ہے اسی لیے کمرا کی چابی دے دیتا ہوں۔

کتاب ادھار دینا بظاہر عام سی بات محسوس ہوتی ہے لیکن اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو شوق سے کتابیں خریدتا ہے، محبت سے انھیں سنبھال کر رکھتا ہے اولاد کے مانند اور باغبان کے مانند کتب خانہ کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس لیے کسی کو کتاب دینا جگر کا ٹکڑا دینے والی بات بن جاتی ہے۔ مگر ہمارے جاہل معاشرہ میں مستعار لینے کے بعد کتاب واپس نہ کرنا فخر کی بات سمجھی جاتی ہے، ہم استاد بالعموم طالب علموں کے ہاتھوں کتاب کا نقصان اٹھاتے ہیں۔ خود میرا بھی ڈاکٹر صاحب جیسا حال ہے، کوئی پیسے ادھار لے کر واپس نہ کرے تو تقاضا نہیں کرتا لیکن کوئی کتاب ڈکار لے تو معاف نہیں کرسکتا۔

جب ڈاکٹر وحید قریشی نے بتایا کہ وہ سمن آباد چھوڑ کر EME کالونی میں کوٹھی بنانے کا سوچ رہے ہیں تو میں نے اس کی مخالفت کی۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب! سمن آباد مرکزی جگہ ہے آپ چالیس برس سے یہاں آباد ہیں، آپ کو یہاں سب جانتے ہیں، علاقہ میں عزت ہے۔ EME نئی آبادی ہے، کون پرسان احوال ہوگا، بارہ پتھر باہر آپ سے کون ملنے آئے گا۔

انھوں نے جواب دیا، کیا کروں بچے نہیں مانتے۔ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی سڑک پر واحد کوٹھی تھی، میں ملنے گیا تو خوش منظر کالونی ویران ویران سی نظر آئی اور یہیں ڈاکٹر صاحب کو تنہائی کا احساس ہوا۔

ایک شام گھنٹی بجی، دروازہ کھولا تو سامنے ڈاکٹر صاحب، یار میں بڑا اداس تھا اس لیے چلا آیا۔ میں نے کہا بسم اللہ!

اس شام ڈاکٹر صاحب نے خوب باتیں کیں، لطیفے سنائے، فقرہ بازی کی، قہقہے لگائے مگر میں تنہائی کی پیدا کردہ اداسی کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ تنہائی کا مداوا انھوں نے ٹیلی فون سے کیا، چناں چہ لاہور اور دیگر شہروں کے احباب سے فون پر رابطہ رکھا۔ اگرچہ میں بھی انھیں فون کرتا رہتا لیکن اس معاملہ میں وہ مجھ سے زیادہ مستعد ثابت ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ عید پر مبارک باد کا سب سے پہلا فون ڈاکٹر صاحب ہی کا ہوتا تھا۔ یوں سمجھیے کہ انھوں نے طویل بیماری کا مقابلہ دواؤں کے ساتھ ساتھ ٹیلی فون سے بھی کیا۔ میں فون کرتا، حال پوچھتا۔ نحیف آواز میں کہتے شکر ہے، ڈاکٹر نے کورٹی زون شروع کر دی ہے۔ ٹھیک ہوں۔ حال احوال کے بعد میں کسی بدخواہ کا ذکر چھیڑ دیتا۔ فوراً آواز میں گرج پیدا ہوجاتی، مجھے یقین ہوجاتا کہ واقعی بہتر ہو رہے ہیں۔

ہماری مشرقی اقدار میں مرنجاں مرنج ہونا لازم ہے مگر ڈاکٹر صاحب مرنجاں مرنج کے برعکس رنجاں رنج تھے۔ پیار محبت سے ان سے جو چاہو منوالو مگر وہ دھونس اور رعب میں آنے والوں میں سے نہ تھے۔ اورینٹل کالج کی مضر بلکہ مضرِ صحت سیاسی فضا نے ان کا مزاج ایسا کر دیا تھا گویا گن لے کر مورچا پر بیٹھے ہوں۔

اگر کبھی ڈاکٹر وحید قریشی کی سوانح عمری لکھی گئی تو اس میں اورینٹل کالج کی معرکہ آرایوں پر مبنی ایک مفصل باب تحریر ہوگا، اس معرکہ کے محرکات اور معرکہ آرا شخصیات اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں اس لیے ان کے تذکرے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس تناظر میں ایک دن میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا:

ڈاکٹر صاحب! آپ کو تحقیق کی جتنی سمجھ ہے، جتنا شاندار کتب خانہ ہے، جتنی اچھی یادداشت ہے آپ نے ان سب سے اتنا فائدہ نہ اٹھایا، اتنا کام نہ کر سکے جتنا آپ کر سکتے تھے، جتنی آپ میں صلاحیتیں تھیں ان سے بھی کام نہ لے سکے جتنا لیا جا سکتا تھا، آخر اس لڑائی میں آپ نے کیا حاصل کیا؟

جواب میں ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ ہمارے Survival کا مسئلہ تھا۔ اگر ردعمل نہ کرتے تو ملازمت ختم ہو چکی ہوتی اس لیے یہ سب کچھ کرنا ضروری تھا۔

ہمارے ہاں غلیظ سیاست کس طرح سے صلاحیتوں کو گہنا دیتی ہے، یہ واحد مثال نہیں۔ ملک کے ادارے سیاست کی وجہ سے برباد ہو رہے ہیں، لیکن یہ بھی ہے کہ ایک دن ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے گھر گئے، انھیں گلے لگایا اور صلح کر لی۔ مجھ سے کہنے لگے، اب ہم عمر کے اس دور میں ہیں کہ کسی وقت بھی بلاوا آ سکتا ہے تو پھر لڑائی جاری رکھنے کا کیا فائدہ؟

میں نے اس فیصلہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے سراہا۔ کہنے کا مطلب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ایسا مزاج تھا کہ:

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں

لکھ رہا ہوں اور یاد آ رہا ہے کہ ان کی ہر گفتگو کا اختتام اس فقرہ پر ہوتا:

اور سناؤ! ان دنوں کیا لکھ رہے ہو

دراصل وہ دوسروں کو کام کرتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے، اسی لیے وہ مشوروں کی صورت میں عملی دلچسپی بھی لیتے تھے۔ مجھے جب کبھی بھی کسی کتاب یا ریفرنس کے سلسلہ میں دقت ہوتی تو میں ڈاکٹر صاحب ہی کو فون کرتا اور وہ ہمیشہ درست معلومات فراہم کرتے۔ ان کی غضب کی یادداشت آخر وقت تک ان کے ساتھ رہی۔

بیماری اور بالخصوص طویل بیماری بڑے بڑوں کے قدم اکھاڑ دیتی ہے۔ جب جسم اور اعصاب رہ جائیں تو خود کو سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے چھ برس کی بیماری کا صحیح معنوں میں مردانہ وار مقابلہ کیا، اس سے ان کے اعصاب کی مضبوطی کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بیماری سے جنگ میں انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بطور دوا استعمال کیا۔ تنہا کمرا ہیں، بستر پر لیٹے لیٹے انھوں نے سیکڑوں کی تعداد میں نظمیں، غزلیں اور دوہے کہہ ڈالے۔ مرض کا مقابلہ طنزیہ نظموں سے بھی کیا، یوں فقرہ بازی نے تخلیق کا ترفع پا لیا۔ انھوں نے طنزیہ اور مزاحیہ دوہے بھی لکھے، بعض طنزیہ دوہے دوستوں پر بھی لکھے، ایک دوہا مجھ پر بھی لکھا۔ ایک دن ملنے گیا تو انھوں نے تازہ غزل سنائی جس کا یہ مصرع ذہن میں رہ گیا:

دوستوں کے اداس چہروں میں اپنا چہرہ دکھائی دیتا ہے

ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری کے دو مجموعے ''الواح'' اور ''نقدِ جاں'' چھپ چکے تھے مگر تحقیق نے ان کی شاعری کا چرچا نہ ہونے دیا۔ بلکہ اکثر لوگوں کو تو یہ علم بھی نہ ہوگا کہ وہ شاعر بھی تھے مگر مرض کی پیدا کردہ تنہائی نے شاعرانہ حس کے لیے گویا مہمیز کا کام کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے غیر مطبوعہ کلام کا کیا بن رہا ہے، اگر یہ شاعری شائع ہو جائے تو بحیثیت شاعر ان کے مقام و مرتبہ کا تعین بھی ہو جائے گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کو مطالعہ کا کتنا شوق تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بیماری کی پیدا کردہ بدمزگی اور اعصابی کشیدگی کے باوجود بھی انھوں نے کتاب سے ناتا نہ توڑا۔ مرض کے دوران ان کی ایک آنکھ تقریباً ضائع ہوگئی تھی اور دوسری بھی کوئی خاص ٹھیک نہ تھی مگر مطالعہ جاری رکھا۔ ایک مرتبہ میں ملنے گیا تو انھوں نے پنسل جیسا لمبا محدب شیشہ دکھاتے ہوئے بتایا کہ اسے سطروں پر رکھ کر مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ ہے شوق کی انتہا!

ایک دن باتوں باتوں میں کیریئر کا ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ جب میں نے بی۔ اے کر لیا تو ہمارے ایک رشتہ دار نے جو سی آئی ڈی میں اچھی پوسٹ پر تھا، مجھے سی آئی ڈی میں ملازم کرانے کی پیش کش کی مگر میرا مزاج اور علمی شوق مزاحم رہا۔

میں نے پوچھا اگر آپ سی آئی ڈی میں چلے گئے ہوتے تو آج آپ کس پوسٹ پر ہوتے؟

کہنے لگے میں اس وقت کم از کم ڈی آئی جی تو یقیناً ہوتا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ تحقیق بھی تو ایک نوع کی سی آئی ڈی ہی ہوتی ہے۔ مرحومین کی درست تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا سراغ لگانا، نایاب کتابوں کا کھوج لگانا، مخطوطوں کو Decipher کرنا، ناقص یا نامکمل مخطوطہ کے گمشدہ اوراق یا خراب یا حذف شدہ سطروں کو قیاس سے مکمل کرنا۔ یہ سب کچھ ادبی سی آئی ڈی ہی تو ہے۔ گویا ڈاکٹر صاحب عمر بھر تحقیق کے بھیس میں سی آئی ڈی ہی کرتے رہے اور اس میں وہ ڈی آئی جی سے بڑھ کر آئی جی کے عہدہ پر سرفراز نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے در ایام جوانی ''شبلی کی حیات معاشقہ'' لکھ کر گویا زبردست دھماکا کیا، اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ۱۹۴۹ء میں پہلے ''ادبی دنیا'' میں بطور مقالہ اور پھر ۱۹۵۵ء میں کتابی صورت میں طبع ہوئی۔ خالصتاً فرائیڈین تحلیلِ نفسی کی روشنی میں شبلی کی شخصیت کا مطالعہ کیا گیا تھا، اپنے وقت کی یہ خاصی نزاعی کتاب تھی۔ اگر ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ انداز اپنائے رکھا ہوتا تو نفسیاتی تنقید کو بہت کچھ دے سکتے تھے لیکن انھوں نے تحقیق کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے انتقال سے لاہور میں حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی روایات پر مبنی رویہ گویا ختم ہوگیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس تحقیقی روایت کے آخری علم بردار تھے اور اب ان کے انتقال کے بعد اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اس ضمن میں حالی کے مقدمہ شعر و شاعری اور میرامن کے باغ و بہار کے تحقیقی مطالعات کا بطور خاص حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے تمام عمر محنت سے رزق حلال کمایا۔ اس لیے جب وہ مقتدرہ قومی زبان، بزم اقبال اور اقبال اکیڈمی جیسے اداروں کے سربراہ بنے تو وہاں بھی محنت اور دیانت داری سے کام کیا اور ملازمین سے کام لیا۔ اس لیے ان کے ماتحت بالعموم ناخوش رہے۔ دراصل ہمارے ہاں سرکاری ملازم، ملازم نہیں بلکہ گھر داماد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کام کر کے خوش نہیں رہتا، جب کہ ڈاکٹر صاحب صرف کام کام اور کام کے قائل تھے، کیوں کہ خود دیانت دار تھے، اس لیے سب سے دیانت داری کی توقع رکھتے تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کام کرنے والے کی قدر بھی کرتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کس سے کیا کام لینا ہے اور کیسے لینا ہے۔ ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر کے لیے یہ اضافی خوبی ہے۔

محقق گر محقق

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

۱۷ اکتوبر کو سات بجے شب کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، ریسیور اٹھایا تو ڈاکٹر گوہر نوشاہی ایک خبر دے رہے تھے۔ ''آپ کو پتا چل چکا ہوگا کہ ڈاکٹر وحید قریشی وفات پا گئے ہیں''۔ ''آپ کو یہ خبر کس نے دی ہے''۔ ''ڈاکٹر رشید امجد نے یہ خبر دی ہے اور ان کو لاہور سے ایک فون موصول ہوا ہے۔'' میں نے ڈاکٹر ہارون قادر کو ٹیلی فون کیا، اس نے دل گیر آواز میں بتایا کہ شام ۵ بجے کے بعد ان کا انتقال ہوا ہے۔ ہارون قادر وہ نیک دل انسان ہے کہ جس نے ڈاکٹر وحید قریشی کی آخری علالت کے دوران ان کی بہت خدمت کی ہے۔ ہارون قادر ہفتہ میں ایک دو بار ان کی علالت کی خبر دیتا رہتا تھا۔ وہ مسلسل بتاتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب بے حد نحیف ہو چکے ہیں۔ وہ فلو، گلے کی خرابی اور بخار کے عارضوں کے سبب سخت پریشان ہیں، ادویات کثرت سے استعمال کرنے پر مجبور ہیں اور ان ادویات نے ان کے معدے کو تباہ کر دیا ہے۔ وہ ہمہ وقت بستر علالت پر دراز رہتے ہیں۔ ہر قسم کی جسمانی حرکت ختم ہو چکی ہے۔ انتقال سے دس بارہ روز قبل یہ خبر دی کہ جسم میں خون بہت کم ہو گیا ہے، اس لیے ہسپتال نے خون طلب کیا ہے اور جی سی یو کے طلبہ نے یہ خون پیش کیا ہے۔ اور پھر آخری چند ایام میں یہ افسوس ناک خبر بھی سنائی کہ ان کی بیگم صاحبہ کو عارضۂ قلب کے سبب ہسپتال میں داخل کروایا گیا ہے۔ اس آشوب کے باعث ڈاکٹر صاحب نے ہمت ہار دی اور رات وہ رو رہے تھے۔ یہ خبر پریشان کرنے والی تھی کہ اب ڈاکٹر صاحب کی دیکھ بھال مسئلہ بن جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ کی علالت کا صدمہ وہ برداشت نہ کر سکے۔ ۱۷ اکتوبر کی شام کو وہ ازبس نڈھال ہو کر مایوسی کی حالت میں اس جہان سے رخصت ہو گئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے میری ملاقات اسلامیہ کالج سول لائنز میں ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں وہ سمن آباد میں رہتے تھے اور میرا گھر بھی وہیں تھا۔ ان ایام میں وہ دمہ کے شدید حملوں کا شکار رہتے تھے۔ میں نے اکثر دیکھا تھا کہ انھیں بہت کثرت سے چھینکیں آتی تھیں اور وہ چھینکتے چھینکتے اور سانس کو سنبھالتے ہوئے ازبس نحیف و نزار ہو جاتے تھے۔ مگر جوں ہی دمہ کا حملہ کمزور پڑتا وہ نارمل ہوتے جاتے تھے اور جب یہ سلسلہ بالکل ختم ہو جاتا تو وہ اپنی معمول کی زندگی بسر کرنے لگتے تھے۔ انھیں دیکھنے والا کوئی انسان یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب نے کتنے خوف ناک مرض کا مقابلہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دمے کے حملوں کو انھوں نے زندگی کا معمول سمجھتے ہوئے قبول کر لیا تھا۔ ۱۹۵۸ء سے ۲۰۰۹ء تک انھوں نے انتہائی بہادری کے ساتھ خرابی صحت کا مقابلہ کیا تھا۔ بدترین الرجی، بدترین دمے، مسلسل فلو اور گلے کی خرابی کے سلسلوں کو جس طرح سے انھوں نے برداشت کیا یہ ان ہی کا حوصلہ تھا۔ میں نے ان سے بہادر مریض آج تک نہیں دیکھا۔ بڑی بات یہ تھی کہ ان کو زندگی سے محبت تھی۔ وہ بہت حوصلہ مند انسان

تھے۔ شدید بیماری کے ایام میں بھی کوئی سال بھر پہلے ایک روز مجھے ٹیلی فون پر کہا، یار میں مقدمۂ شعر و شاعری کا نیا ایڈیشن شائع کروانے لگا ہوں بس کچھ نظر ثانی کا کام کرنے کی دیر ہے۔ میں جانتا تھا کہ خرابی صحت کے باعث وہ نظر ثانی کا کام نہیں کر سکیں گے۔ وہ اپنے بہت سے نامکمل رہ جانے والے علمی منصوبوں کے ساتھ بالآخر ۱۱ اکتوبر کی خاموش شام کو رخت سفر باندھتے ہوئے سورج کے ساتھ خود بھی رخت سفر باندھ کر رخصت ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی رات کو ٹیلی ویژن کے بہت سے سٹیشنوں سے ان کی وفات کی خبریں دکھائی جانے لگیں اور ان کے تلامذہ اور احباب SMS کے ذریعے ان کی وفات حسرت آیات کی خبریں موبائل کے ذریعے پہنچانے لگے۔ دوسرے روز ان کے جنازے پر عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد غم و افسوس کے عالم میں آہستہ آہستہ مسجد کی طرف رواں تھی۔ جہاں نماز جنازہ کے بعد ان کو ای ایم ای کے قبرستان میں سپرد خاک کیا جانا تھا۔ ۱۱۸ اکتوبر کی دوپہر نے اردو ادب کے ایک بڑے عالم کو زمین کے سینے میں خاموشی سے اترتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی اردو تحقیق کا ایک روشن باب ختم ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی اپنے دور کے ممتاز محقق تھے۔ ان کا تعلق پنجاب کے مرکز تحقیق یونیورسٹی اورینٹل کالج کی علمی روایت سے تھا اور اس علمی روایت کے پس منظر میں بیسویں صدی کے آغاز کی یورپی تحقیقی روایت تھی۔ یہ بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ تھا جب اورینٹل کالج کی مشرقی روایت سے فیض یاب ہونے والا ایک نوجوان لندن میں قانون کی تعلیم کے حصول کے لیے جا پہنچا۔ اس کا اصل مقصد تو بیرسٹر بن کر ہندوستان واپس آنے اور وکالت کرنے کا تھا، مگر ہوا یہ کہ یہ نوجوان حالات کی گردش کے سبب قانون کو چھوڑ کر فارسی علم و ادب اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تحقیق میں مصروف ہو گیا۔ یہ نوجوان حافظ محمود شیرانی تھا، جو مستقبل میں اردو تحقیق کا 'معلم اول' بننے والا تھا۔ محمود شیرانی نے لندن کے قیام کے زمانے میں مخطوطہ شناسی کے فن میں بے مثال مہارت حاصل کی۔ اس دوران میں انھوں نے یورپ میں تاریخی تحقیق کے طریق اور اصولوں کا بغور مطالعہ کیا۔ یورپ میں تحقیق و تدوین کی روایت سے وہ مستفیض ہوئے۔ محمود شیرانی کے بعد لاہور کے دو اور نوجوان سکالر عربی اور فارسی میں اعلیٰ تحقیق کے لیے لندن پہنچے، یہ نوجوان محمد شفیع اور محمد اقبال تھے۔ جو بعد ازاں مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد اقبال کے نام سے علمی حلقوں میں معروف ہوئے۔ ان دونوں حضرات نے لندن کے بلند پایہ محقق اساتذہ کی نگرانی میں عربی اور فارسی ادبیات میں تحقیقی کام کیے تھے اور یورپ کی جدید تحقیقی روایت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ واپسی پر مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد اقبال یونیورسٹی اورینٹل کالج سے وابستہ ہوئے۔ محمود شیرانی ۱۹۲۲ء میں اسلامیہ کالج میں تدریس کے فرائض میں مصروف ہوئے، ۱۹۲۸ء میں وہ اورینٹل کالج سے وابستہ ہوئے اور یوں یونیورسٹی اورینٹل کالج جدید تحقیق کا اولین مرکز بن گیا، لیکن اس سے بہت پہلے انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ڈاکٹر لائٹنر انتھروپولوجی اور لسانیات میں اعلیٰ درجے کی تحقیق پیش کر کے اورینٹل کالج کا نام روشن کر چکے تھے۔

بیسویں صدی کے ربع اول تک ہندوستان میں تحقیق نام کی چیز تو تھی مگر معیار کی حامل نہ تھی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع نے تحقیقی مقالوں کا آغاز کیا تو اردو تحقیق کو اعتبار کا درجہ حاصل ہونے لگا۔ ان لوگوں کے کام کی اساس تاریخی تحقیق پر تھی اور تاریخی تحقیق کا مسلک ان کے ذریعے معروف ہونے لگا۔ اردو میں پہلی بار جدید تحقیقی اصولوں کی بنیاد پر ادب پاروں، مخطوطات اور مصنفین کے کام کا جائزہ لیا جانے لگا۔ اس نئی تحقیقی روایت کے حوالے سے محققین نے دیکھا کہ اردو ادب

میں پہلی بار مصنف کے دور، اس کے پس منظر، سیاسی و ثقافتی تاریخ اور ادبی و لسانی روایت پر زور دیا گیا۔ مصنف کے سوانحی کوائف پر خصوصاً توجہ دی گئی اور ان کوائف کی صحت کو اہمیت حاصل ہوئی۔ ہر قسم کے حقائق کی سند خصوصاً توجہ کا مرکز بنی اور یہ بات طے ہوئی کہ مستند اسناد کے بغیر کسی حوالے پر یقین نہیں کیا جائے گا۔ ضعیف اسناد اور غیر معتبر حوالوں سے ہر حال میں گریز کیا جائے گا۔ بنیادی مآخذ استعمال کیے جائیں گے۔ ثانوی مآخذ صرف اس وقت استعمال ہوں گے جب بنیادی مآخذ دست یاب نہ ہو سکتے ہوں۔ اورینٹل کالج کے تحقیقی مرکز نے جدید طریق تحقیق کے مطابق دستاویزات کی جانچ پرکھ کے اصول وضع کیے، داخلی شہادتوں سے کسی دستاویز کے مسائل حل کرنے کے اصول بنائے گئے۔ جن میں مصنف کا نام تلاش کرنا، دستاویز کا عہد ڈھونڈنا اور دستاویز کے مقام تصنیف کا تعین کرنا تھا۔ اورینٹل کالج نے صحت متن کی روایت قائم کی اور معیاری متون جدید تدوین کے اصولوں کی روشنی میں شائع کیے۔ اس علمی و تحقیقی روایت سے پورا ہندوستان فیض یاب ہوا۔ رشید حسن خان اور قاضی عبدالودود اسی روایت کے پیروکار تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، شیرانی صاحب کے تلامذہ میں تھے اور ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ کے شاگردوں میں تھے۔ اس حوالے سے ان کا تعلق تحقیق کے دبستان شیرانی سے قائم ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اسی دبستان کے پیرو تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے تحقیق میں جس بے خوفی، صاف گوئی، بے باکی اور تنقید کی گہری کاٹ کا مظاہرہ کیا تھا، میرے خیال میں یہ شیرانی صاحب کی تحقیقی شخصیت اور تحقیقی اخلاقیات ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شیرانی کی روایت کو اورینٹل کالج کے مرکز تحقیق میں اگر کسی محقق نے نبھایا تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے، اور اب ان کے رخصت ہونے سے یہ ٹھوس روایت بہت کمزور ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو دستاویزی تحقیق کے فن پر گہری دسترس حاصل تھی۔ دستاویزی تحقیق میں کسی متن کی داخلی شہادتوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ شہادتیں تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، لسانی اور سیاسی بھی ہو سکتی ہیں۔ اگر کسی دستاویز میں کسی سبب سے ترقیمہ کی عبارت موجود نہیں ہے تو اس قسم کی شہادتیں ایک اعتبار سے ترقیمہ کی عدم موجودگی میں دستاویز کے عہد تصنیف یا عہد کتابت کی مناسب طور پر نشان دہی کر سکتی ہیں۔ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے قلمی نسخے کا زمانہ کتابت مصنف کے زمانہ تصنیف کے مطابق قرار دیا جاتا ہے یعنی نسخہ چھ سو برس قدیم بتایا جاتا ہے۔ اس مقام پر دستاویزی تحقیق سوال کرتی ہے کہ یہ نسخہ چھ سو سال پرانا ہے یا نہیں؟ اور اس سوال کا جواب دینے کے لیے دستاویزی تحقیق متن کی داخلی شہادتوں کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے طبع شدہ نسخہ پر جب تبصرہ کیا تو متن کی داخلی شہادتوں کو انھوں نے لسانی حوالے سے پرکھا اور کچھ الفاظ کی نشان دہی کر کے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ نسخہ کا زمانہ کتابت گیارھویں صدی کا اوائل یا حد دسویں صدی کا آخر ہے۔ وحید صاحب کا لسانی تجزیہ دلچسپ داخلی شہادتوں پر مشتمل ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ:

''شائع شدہ متن کی بنیاد پر یہ قیاس بے موقع نہ ہوگا کہ نسخے کی املا گیارھویں صدی کے اوائل میں ہوئی ہوگی۔ نسخ کا یہ رجحان جو اس نسخے میں ہے چھٹی صدی میں فارسی میں شروع ہوا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی تک بعض حروف کے دوائر کو حاشیے میں دور تک کھینچ کر لے جانے کا طریقہ عام تھا۔ ت۔ تھ اور گ کی مرقومہ صورتیں جو نویں، دسویں، گیارھویں اور بعض خاص خاص صورتوں میں بارھویں صدی کے اوائل تک آئی ہیں لیکن بعض داخلی شہادتیں کاتب کو نویں صدی ہجری سے متعلق کرنے سے مانع ہیں۔ دکنی اردو میں

''ہور'' کی جگہ ''اور'' کا استعمال گیارھویں صدی میں عام ہوا لیکن نویں صدی میں اس کا رواج مشکوک ہے، کم از کم چار مقامات پر ''اور'' کا استعمال (۲۱۳، ۲۸۹، ۳۹۵، ۸۹۵) کاتب کی دخل اندازی سمجھا جائے تو زمانہ کتابت بخوبی گیارھویں صدی قرار پا سکتا ہے۔ اسی طرح ''جیو'' کی جگہ ''جی'' (ص ۱۵۵) بھی کاتب کی کارستانی ہو تو عجب نہیں۔ شعر ۵۴۱، ۵۵۵ اور ۶۲۰ میں ٹھانو، نانو، پانو، چھانو، نانو رقم کرتے ہیں اور نون غنہ کے بغیر یہی املا نویں دسویں صدی ہجری کی ہے۔ لیکن شعر ۸۵۰ میں ''کٹانوں'' نون غنہ کے ساتھ درج ہوا ہے۔ اسی طرح ''یہ'' کا استعمال گیارھویں صدی ہجری کے اوائل کی چیز ہے اور اس کی جگہ ''یو'' مستعمل تھا۔ شعر نمبر ۵۰۶ اور ۶۹۶ میں ''یہ'' کا لفظ پایا جاتا ہے۔ قیاس ہو سکتا ہے کہ نسخے کے کاتب کا زمانہ گیارھویں صدی کا اوائل یا دسویں کا آخر ہے۔''

آج مجھے ۱۹۵۹ء کا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ ان ایام میں میری دلچسپی اردو صحافت کی تاریخ میں ہوئی تھی۔ میں نے لاہور کے پہلے اردو اخبار ''کوہ نور'' پر ایک مقالہ لکھنے کا پروگرام بنایا اور اپنے طور پر مواد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر بہت مختصری معلومات حاصل ہو سکی۔ اتفاق سے میری رسائی پنڈت شیونرائن شمیم کے مضمون The Kohi-e-Noor of 1851 تک ہو گئی یہ مضمون پنجاب یونیورسٹی کے تحقیقی مجلے "Journal of The Punjab Historical Society" میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس کی نقل تیار کر لی۔ کسی مضمون سے یہ معلوم ہوا کہ یونیورسٹی لائبریری میں کوہ نور کی ایک فائل بھی موجود ہے۔ یہ شاید ۱۸۵۶ء کی فائل تھی۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو شیونرائن شمیم والا مضمون دکھایا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ یونیورسٹی لائبریری والی فائل کا مطالعہ کرو۔ دوسرے دن میں اورینٹل سیکشن میں جا پہنچا اور کوہ نور کی فائل طلب کی۔ لائبریری اسسٹنٹ نے مجھے غور سے دیکھا اور کارڈ دکھانے کے لیے کہا۔ کارڈ تو تھا نہیں، مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ یہ ماجرا دوسرے روز کالج میں ڈاکٹر صاحب کے گوش گزار کیا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا، کوئی بات نہیں کل دوپہر کو میں خود تمھارے ساتھ چلوں گا۔ دوسرے روز وہ مجھے لائبریری لے گئے۔ اس وقت مشتاق صاحب انچارج تھے ان سے تعارف کرایا اور یوں مجھے لائبریری میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ مقالہ لکھنے کے دوران میں میں نے کئی بار شکایت کی کہ یہ تحقیقی کام بہت مشکل اور تھکا دینے والا ہے۔ اسی قسم کی شکایت میرے دوست گوہر نوشاہی اور ذوالفقار احمد بھی کیا کرتے تھے۔ اور ایسے موقعوں پر ہمیں وہ ایک ہی جواب دیا کرتے تھے کہ تحقیق جگر کاوی، جان کاوی اور سخت جانی کا تقاضا کرتی ہے اور محقق میں یہ خوبیاں ضرور ہونی چاہییں۔ اس وقت تو ان کی ان باتوں کی ٹھیک طور پر سمجھ نہیں آتی تھی مگر مستقبل میں جب تحقیق کی خاردار منزلوں سے گزرنا پڑا تو جگر کاوی اور جاں کاوی کی عملی طور پر سمجھ آ گئی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جب میں نے ان کو کئی بار دمہ کے شدید دوروں کی کیفیت سے گزرتے ہوئے دیکھا تو ایک روز ہمت کر کے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ سانس کے اس آشوب میں کس وجہ سے مبتلا ہوئے ہیں؟ کہنے لگے، بھئی مجھے قلمی نسخوں سے عشق ہے۔ پی ایچ ڈی کے دوران میں اور اس کے بعد کا زمانہ ان نسخوں کی صدیوں پرانی گرد اور بند رہنے والی زہریلی ہوا کو پھانکتے ہوئے گزارا تھا۔ بس اس کی وجہ سے بدترین الرجی کا شکار ہوا جس کے باعث دمہ لاحق ہوا اور یہی وہ جگر کاوی ہے جس کی مثال میں دیتا رہا ہوں۔ وہ کام جو دوسرے لوگوں نے بیس پچیس سال میں کیے، میں نے وہ کام نو دس سال میں کرنے کی کوشش کی ہے، یہ سب اسی کا خمیازہ ہے۔ اور واقعتاً وہ اس جگر کاوی کا خمیازہ دم آخر تک بھگتتے رہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی جب کسی موضوع پر کام کرنے کا فیصلہ کرتے تو اپنی تمام تر ممکنہ کوششوں سے مواد کی فراہمی کا کام شروع کر دیتے۔ مواد کی فراہمی صرف بنیادی اور اہم مصادر تک محدود نہ رہتی۔ وہ ثانوی مصادر کے لیے بھی یکساں طور پر سعی کرتے تھے، بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے ماخذوں تک رجوع کرنا ضروری سمجھتے تھے اور یہ ان کی اخلاقیات تحقیق کا حصہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے تحقیق کی ابتدا کی تو مجھ سے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کسی بھی حالت میں کسی ماخذ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بعض اوقات کسی عام سے مآخذ میں کہی گئی کوئی بات بے حد اہمت کی حامل ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ ماخذ استعمال نہ کیا جائے تو تحقیق میں خلا رہ جائے گا۔ بلاشبہ اساسی اہمیت تو بنیادی ماخذوں ہی کو حاصل رہے گی مگر ثانوی اور اس سے بھی کم درجے کے مآخذ تحقیقی کام میں معاونت کر سکتے ہیں۔ چوں کہ وہ تاریخی یا دستاویزی تحقیق کے دبستان سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اپنے کام میں وہ تاریخ کے ماخذوں کی طرف بالخصوص توجہ دیتے تھے۔ ان کے تحقیقی سرمایے میں ماخذوں کے استعمال کا یہ طریق کار خاص طور پر توجہ طلب کرتا ہے۔ ''کلام جہاندار''، ''حیدر بخش حیدری''، ''شیر علی افسوس'' اور ان جیسے دیگر مقالوں میں تاریخی تحقیق کے طریق کار کو عملی طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی مجوزہ موضوع پر جب ان کے پاس تسلی بخش طور پر مواد اکٹھا ہو جاتا تو پھر وہ مواد کی صحت کا جائزہ لیتے۔ اسے اوریجنل مواد، قابل ذکر مواد اور عمومی مواد کے درجات میں تقسیم کرتے، مقالہ کا خاکہ مرتب کرتے۔ آہستہ آہستہ ان کے ذہن میں مواد سے ترتیب پانے والے تاثرات، اہم نکات اور نتائج کی شکل بننے لگتی۔ موضوع سے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر نمایاں ہونے لگتا اور یوں بتدریج مسودہ تیاری کے مراحل سے گزرنے لگتا تھا۔ مسودہ مکمل ہونے پر وہ اسے بار بار معروضی انداز نظر سے دیکھتے تھے۔ پیش کردہ حقائق کی جانچ پرکھ پر پوری توجہ صرف کرتے تھے۔ کوئی مشتبہ، غیر صحت مند یا غیر مستند حوالہ بالکل درج نہ کرتے تھے۔ اسناد اور حوالوں کی صحت کا ازبس خیال رکھتے تھے۔ تحقیق میں یہ امور ان کے Cult کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ ایک بار میں نے لکھنو کے ایک تذکرہ نویس کا حوالہ درج کیا تھا۔ انھوں نے نہ صرف اس حوالے کو کاٹ دیا بلکہ آیندہ کے لیے اس تذکرہ نویس کو تحقیق سے خارج کرنے کی ہدایت کر دی۔ ان کا تجزیہ یہ تھا کہ اس کے بیانات کم زور ہیں، سنی سنائی روایات پر مشتمل ہیں جب تک ان کی سند نہ ملے ان پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔

جس زمانے میں میں نے مصحفی پر اپنے تحقیقی مقالے کا خاکہ اور کتابیات کی فہرست تیار کر کے ان کو دکھائی تھی، اس وقت انھوں نے تاریخ اودھ کے مصنف نجم الغنی کے نام کے ساتھ گول دائرہ لگا کر اس میں سوالیہ نشان لگا دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ نجم الغنی تاریخی سند کے اعتبار سے بہت ناقابل اعتبار ہے۔ اس سے بچ کر چلنا محتاط رہنا اور اس کے ہر بیان کی سند کا خیال رکھنا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اکثر اوقات بعض محقق بنیادی ماخذوں کو درج کرتے وقت غلطیاں کر جاتے ہیں اور جب کوئی دوسرا محقق ثانوی ماخذ کے طور پر اس مواد کو استعمال کرتا ہے تو اس کے ہاں یہ غلطیاں منتقل ہو جاتی ہیں، اس لیے ثانوی ماخذوں کی جگہ بنیادی ماخذوں کی طرف دیکھنا چاہیے۔ بعض اوقات فارسی متن کے مطالب کو نہ سمجھنے کی صورت میں مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے کاموں کی مثالیں پیش کرنے کے لیے وہ ''لکھنو کا دبستان شاعری'' کی مثالیں پیش کیا کرتے تھے۔ مثلاً ابواللیث صدیقی نے ریاست اودھ کے ہونے والے حکمران میر محمد امین کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:

''دہلی پہنچ کر میر محمد امین نے بعض درباریوں سے توسل پیدا کیا اور بقول مصنف عماد السعادت اکثر جایدادوں

کو ٹھیکے پر لے کر ایمان داری اور دیانت سے کام لیا اور اتنا اثاثہ بہم پہنچا لیا کہ عافیت سے دن گزر سکیں۔ اس عرصہ میں نواب مبارز الدولہ سربلند خاں صوبہ دار گجرات سے سلسلہ پیدا ہو گیا۔ (اس سے لڑنے کے بعد) میر محمد امین گجرات سے شاہ جہاں آباد پہنچے اور شہزادگان دہلی کی جایدادوں کا ٹھیکا لینا شروع کیا اور شہزادوں ہی کے ذریعے فرخ سیر کے دربار تک رسائی پیدا کی۔ دوران ولی عہدی میں ہی فرخ سیر نے انھیں منصب ہزاری (منصب والاشاہی) عطا کیا، اور یہ شاہزادے کے رفقاء میں شامل ہو گئے۔''

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ہاں فارسی متن کو غلط سمجھنے کی وجہ ترجمہ کی غلطی تھی۔ دراصل وہ 'عماد السعادت' کا مفہوم نہ سمجھ سکے تھے۔ ڈاکٹر وحید صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا تھا:

جائیدادوں کے ٹھیکے کا تذکرہ صاحب عماد السعادت سے لیا گیا ہے جیسا کہ بقول ''عماد السعادت'' سے ظاہر ہے۔ جس جملے کا مطلب ڈاکٹر صاحب نے یہ لیا ہے وہ اصل میں یوں ہے:

''(میر محمد امین) با عامل پیشگان عمدہ درخوردہ''

یعنی میر محمد امین نے افسروں سے خوب بنا رکھی تھی۔ فارسی زبان کی کسی تاریخ سے میر محمد امین کے کسی زمانے میں بھی تاجر یا ٹھیکیدار ہونے کی سند نہیں ملتی۔ شہزادگان دہلی کی جائیدادوں کا ٹھیکا بھی غلط ہے۔''

اردو تحقیق پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ برصغیر میں ڈاکٹر صاحب جیسے دو تین محقق ہی ایسے تھے جو اردو تحقیق کو اس نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ ان کا امتیاز یہ تھا کہ وہ دیگر محققین کے مقابلے میں تجزیاتی انداز رکھتے تھے اور ان کے تجزیے بصیرت افروز بھی ہوتے تھے۔ اردو تحقیق میں جس چیز کا فقدان رہا ہے، اس کا تعلق بصیرت سے ہے۔ اردو حقائق کی اعلیٰ درجے کی تحقیق کرنے والے بصیرت کا مظاہرہ کرنے سے محروم نظر آتے ہیں۔ وہ حقائق کے ڈھیر تو لگا دیں گے مگر اس ڈھیر سے نتائج نکالنے اور نتائج سے کوئی بصیرت افروز نقطہ نظر بنانے کی طرف توجہ مبذول نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تحقیق اب تک اسی مقام پر کھڑی نظر آتی ہے کہ جہاں پر وہ ۱۹۴۷ء سے قبل دیکھی جا سکتی تھی۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے ۱۹۶۸ء میں اردو تحقیق کے مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں چند اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی جن میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ اردو کے محقق معیار کی جگہ مقدار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ شکر کے کارخانے جس طرح اپنی پیداوار کا عملی ثبوت مہیا کرتے ہیں اسی طرح تحقیق ادب میں بھی مقدار پر توجہ دی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی چوں کہ خود معیاری تحقیق کے قائل تھے اس لیے وہ ادبی تحقیق کے عمومی معیارات پر زور دیتے تھے۔ تحقیق کے عالم اور مدرس کی حیثیت سے وہ اپنے عہد کی تحقیق کے عام معیارات سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے محقق محنت سے بھاگتے ہیں اور تحقیقی کام میں آسان راستے تلاش کرتے ہیں۔ اس سہل انگاری سے پیدا ہونے والے مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ نکات بیان کیے تھے:

الف: حوالوں میں جعل سازی، یعنی متاخر کتب سے مواد لے کر معاصر کتب کا حوالہ درج کرنے کی رسم۔

ب: حوالوں کو قلم بند کرنے میں بے احتیاطی

ج: دوسروں کے کیے ہوئے علمی کام کو معمولی ردو بدل سے (بغیر حوالے کے) اپنے ہاں سمو لینے کا رواج۔

د: کتابیات کی ترتیب میں سائنٹفک طریقے سے غفلت۔

ہ: متون کی تصحیح میں عدم احتیاط، غیر معیاری نسخوں کو بنیادی نسخہ قرار دینے کی غلطی، اختلاف نسخ کے قلم بند کرنے میں بے احتیاطی، پورے علمی ذخیرے کو سامنے رکھ کر کام شروع کرنے کے بجائے ناقص ذرائع پر بھروسا، چھپائی اور پروف ریڈنگ میں غلطی۔

اب یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۸ء میں ہماری تحقیق کی جن خامیوں کی طرف اشارہ کیا تھا ہمارے اس عہد تک آتے آتے ان میں اضافہ ہی ہوا ہے اصلاح احوال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوسکی ہے۔ ہماری دانش گاہوں میں ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کے سکالرز میں ایک متعدی بیماری وبا کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے۔ تحقیقی مقالے اس بیماری سے نڈھال نظر آتے ہیں۔ صورت یہ ہے کہ سکالرز اپنے مقالوں میں دیگر محققین کے خیالات، تجزیے اور حقائق کو اپنے ڈھب کے مطابق مختصر کر کے یا پھیلا کر یوں پیش کرتے ہیں کہ جیسے یہ سب کچھ ان کی اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ اس کام میں حوالہ دینا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ ایک اور مسئلہ بھی تحقیقی مقالوں کی تنقید میں خاصا پریشان کن ہے۔ ایم اے، ایم فل کے مقالوں میں سکالرز کثرت سے اقتباسات استعمال کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے دو تین سطریں لکھ کر ایک اقتباس پیش کر دیتے ہیں، پورے کا پورا مقالہ اقتباسات کا مجموعہ دکھائی دیتا ہے۔ طلبہ کسی مسئلہ کو بیان کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ تحقیقی مسئلے کا تجزیہ نہیں کر سکتے، نتائج اخذ نہیں کر سکتے بس ان کا زور اقتباسات ہی پر چلتا ہے۔ اس قسم کے اسلوب تحقیق کو لاہور کے ایک غالب شناس نے دریافت کیا تھا اور اب ان کی یہ دریافت دانش گاہوں میں فروغ پا چکی ہے اور رائج الوقت سکے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

عمر کے آخری حصے میں وہ صاحب فراش ہو گئے تھے۔ مگر ان کی زندہ دلی، حاضر دماغی، حصول علم اور تصنیف و تالیف کی خواہش کم نہ ہوئی تھی۔ ان ایام میں وہ اکثر گھر بیٹھے بیٹھے دوستوں سے ہم کلام ہونے کے لیے ٹیلی فون کرتے رہتے تھے۔ اس دوران میں وہ دوستوں کے علمی منصوبوں کے اذکار سے محظوظ ہوتے اور اپنی سوچ اور فکر کا اظہار بھی کرتے رہتے۔ میں ان کو کبھی کبھی ٹیلی فون کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی ان کا ٹیلی فون بھی مجھے موصول ہوتا تھا۔ ۲۰۰۳ء میں جب میری کتاب ''اردو ادب کی تاریخ'' شائع ہوئی تو میں نے ان کو ایک نسخہ بھجوایا۔ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ان کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کتاب کی مجموعی ساخت کی تعریف کی۔ تنقید کے طریق کار، اسلوب، تہذیب اور سیاسی تاریخ کے امتزاج کی تحسین کی اور کہا کہ تم جالبی صاحب سے ایک قدم آگے بڑھ گئے ہو۔ صاحب فراش ہونے کے بعد جب بھی ان کا فون آتا، وہ مجھ سے دو باتیں ضرور پوچھتے تھے۔ اردو ادب کی تاریخ کی دوسری جلد کہاں تک پہنچی ہے اور یہ کہتے کہ یار جلدی سے یہ کام پورا کردو۔ دوسری بات یہ تھی کہ انجمن پنجاب کے ساتھ ان کی خصوصی دلچسپی رہی تھی اور میں انجمن پنجاب کے آثار مرتب کر کے شائع کرنے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ زور دے کر کہتے کہ انجمن پر جو کچھ مل سکا ہے اسے جلد مرتب کر کے شائع کرو۔ افسوس ان کی زندگی میں یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

کتاب کے ساتھ ان کی دلچسپی بے مثال تھی۔ اچھی کتاب جہاں سے بھی دستیاب ہوسکتی وہ ضرور منگواتے تھے۔ بستر علالت پر بھی یہ دلچسپی روز اول کی طرح تھی۔ انتقال سے کوئی سال بھر پہلے ڈاکٹر صدیق جاوید نے ان سے ایلنک کی کتاب

"The Art of Literary Research" کا ذکر کیا۔ یہ کتاب صدیق جاوید یو ایس اے سے لائے تھے۔ اتفاق سے اس وقت یہ کتاب میرے زیرِ مطالعہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی فوٹو کاپی کے لیے خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے اس کی کاپی تیار کر کے صدیق جاوید کے سپرد کی، جو ان تک پہنچا دی گئی۔ اس علمی کتاب کے ملنے پر وہ بہت خوش ہوئے۔ بعد میں جب میں نے یہ سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کے دل میں اس کتاب کی طلب کیوں پیدا ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر گیان چند کی ''تحقیق کا فن'' بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے اور موصوف نے اس کے حوالے بار بار دیے ہیں، اسی لیے ڈاکٹر صاحب اس کتاب کو دیکھنے کے لیے مشتاق تھے۔

ان کے علمی منصوبے طویل مدت تک چلتے رہتے تھے۔ صاحب کسی موضوع کا انتخاب کرتے تو پھر پوری طرح اس کی تیاری میں لگ جاتے تھے۔ جب تک پورا مواد حاصل نہ ہوتا وہ کام شروع نہ کرتے تھے، لیکن ہم لوگوں کو یعنی مجھے اور گوہر نوشاہی کو وہ ایک نصیحت بار بار کیا کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ محقق کو مواد کے حصول میں بھرپور سعی کرنی چاہیے اور جب کچھ مدت گزر جانے کے بعد وافر مقدار میں مواد دستیاب ہو جائے تو اس کے بعد ایسے مواد کے حصول میں وقت ضائع نہ کرنا چاہیے کہ جس کی دست یابی کے امکانات بہت کم ہوں۔ اس لیے مناسب بات یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہو گیا ہے اس پر انحصار کر کے تحقیق کو شائع کر دیا جائے۔ ذہن میں یہ بات رکھنی چاہیے کہ اگر متوقع مواد حاصل ہو جائے تو اسے طبع شدہ کام میں استعمال کیا جائے اور آیندہ کسی موقع پر اس ترمیم شدہ کام کو شائع کروا دیا جائے۔ ایسے کاموں کے لیے وہ اکثر پروفیسر وزیر الحسن عابدی کی مثال دیا کرتے تھے کہ جو مدتوں تحقیق غالب پر اپنا کام شائع نہ کر سکے کہ کام میں کچھ حوالے یا کچھ مواد دستیاب نہ ہو رہا تھا لیکن اس وقت مجھے ڈاکٹر وحید قریشی ہی کے بعض کاموں کا خیال آ رہا ہے کہ جن پر وہ کئی دہے فراہمی مواد میں صرف کر چکے تھے مگر کام مکمل نہ ہو سکا تھا۔ مثلاً سنہ ساٹھ کے لگ بھگ میں نے پہلی بار سنا کہ وہ ''سحر البیان'' کا ایک مثالی ایڈیشن شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس میں متن پر تحقیق تو شامل تھی لیکن وہ متن سے متعلقہ مواد کی ایک فرہنگ بھی تیار کرنے کا منصوبہ رکھتے تھے۔ میں اس منصوبہ کے متعلق ان کی باتیں ایک طویل مدت تک سنتا رہا تھا، افسوس یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ ''سحر البیان'' کی فرہنگ میں وہ ان تمام پھلوں، پھولوں، پیڑوں، باغوں، کھانوں، پوشاکوں، سازوں، موسیقی کی اصطلاحوں، راگوں، راگنیوں، پرندوں، زیوروں، قیمتی جواہرات اور فن خطاطی میں استعمال ہونے والے خطوں کی توضیحات کے ساتھ ساتھ متعلقہ لفظوں کی تصاویر بھی شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بے شمار کتب فراہم کر لی تھیں۔ مجھے انھوں نے پھولوں، پیڑوں اور خطاطی کے نمونوں کی بہت سی ایسی کتابیں دکھائی تھیں کہ جن کی تصاویر وہ سحر البیان کی فرہنگ میں چھاپنا چاہتے تھے مگر یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ دراصل ۱۹۷۰ء کے بعد وہ انتظامی کاموں میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ شعبہ اردو کے علاوہ یونیورسٹی کی لاتعداد انتظامی کمیٹیوں کے وہ ممبر بھی تھے اور چیئرمین بھی...... اس قسم کی مصروفیات کے بعد علمی کاموں کے لیے ان کے پاس بہت کم وقت بچتا تھا۔ ادبی نوعیت کے کام تو وہ کرتے رہے مگر تحقیقی کام سکون، سعی اور مسلسل توجہ کے طالب ہوتے ہیں، مگر ڈاکٹر صاحب بہت مصروف ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے وہ طویل المعیاد منصوبے جو انھوں نے اپنی تحقیقی زندگی کے شباب یعنی سنہ ساٹھ کی دہائی سے کچھ پہلے شروع کیے تھے وہ نامکمل رہ گئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی جب کسی قلمی نسخے پر کام کرنے کا عزم کرتے تو سب سے پہلے اس نسخہ کی نقل تیار کرواتے اور یہ کام کسی ماہر

نقل نویس کے سپرد کیا جاتا تھا جو اردو اور فارسی پر قدرت رکھتا تھا۔ یہ نقل خوش خط اور نسبتاً جلی حروف میں بنائی جاتی تھی۔ جب نقل مکمل ہو جاتی تو وہ اس کا بغور مطالعہ کرتے تھے۔ ایک ایک سطر، ایک ایک لفظ کی دقت نظر سے جانچ پرکھ کا کام پہلی خواندگی میں کرتے جاتے تھے اور ان کو اس ابتدائی خواندگی میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس نقل کا متن کن کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے کیا مسائل ہیں اور نقل نویس نے کس حد تک ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اور کہاں لاپروائی برتی ہے۔ اور کن کن مقامات پر نادانستہ طور پر غلطیاں کی ہیں اور کن مقامات پر وہ زبان و بیان کو نہیں سمجھ سکا ہے اور لفظ اس کی گرفت میں نہیں آ سکے ہیں۔ اس پہلی خواندگی کے بعد وہ ایک ایک لفظ، تراکیب اور محاوروں کا جائزہ لیتے جہاں جہاں اشکال کے مسائل نظر آتے ان پر غور و فکر کرتے، نامانوس الفاظ کو دیکھتے اور ان کی صحیح شکلیں دریافت کرتے۔ اس قسم کے کام میں زیادہ پیچیدگی لفظوں کی املا پیدا کرتی ہے مگر ڈاکٹر صاحب چوں کہ پچھلی کئی صدیوں کی املا سے گہری واقفیت رکھتے تھے اس لیے ان کو وقت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے مخطوطہ شناس شاگردوں کو پرزور طور پر ہدایت کیا کرتے تھے کہ مخطوطوں میں املا شناسی تحقیق کا بہت اہم کام ہے اور اس پر قدرت پانے کا بڑا طریقہ یہ ہے کہ دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدیوں کے مخطوطات کی املا کا جائزہ دسویں صدی سے شروع کریں پھر آہستہ آہستہ بارھویں صدی تک آ جائیے اور ہر صدی کی املا میں ارتقائی طور پر جو تبدیلیاں نظر آتی ہیں ان کو نوٹ کرتے جائیے۔ اس طرح سے مخطوطات کی خواندگی سہل ہوتی جائے گی۔ مخطوطوں میں لفظوں کے معنوں کو سمجھنے کے لیے جو مشکل پیش آتی ہے اسے حل کرنے کے لیے ان کے کتب خانے میں لغات کا ایک بہت عمدہ ذخیرہ موجود تھا جس سے وہ استفادہ کرتے تھے۔ میں نے مخطوطہ شناسی میں استعمال ہونے والا Megnifying Glass بھی پہلے پہل ان کے پاس دیکھا تھا۔ مخطوطات میں کٹے پھٹے، بجھے ہوئے نم زدہ اور بہت مدھم لفظوں کو پڑھنے کے لیے وہ یہ شیشہ استعمال کیا کرتے تھے۔ جس سے لفظوں کی خوابیدہ شکلیں فی الفور بیدار ہو جاتی تھیں۔ میں نے ان کے تتبع میں یہ شیشہ دو بار بڑے شوق سے خریدا تھا۔ پہلی بار اس وقت جب میں اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے لیے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بیٹھ کر ذخیرہ کیفی میں موجود کلیات مصحفی کے بڑے مخطوطے کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور دوسری بار اس وقت جب کہ میں اوساکا یونیورسٹی میں تھا اور میرا شیشہ لاہور میں رہ گیا تھا، اوساکا سے میں نے ایک بہت بڑھیا شیشہ بڑے شوق سے خریدا تھا اور یہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی

امجد اسلام امجد

ڈاکٹر وحید قریشی گزشتہ چند برسوں سے مسلسل علیل چلے آ رہے تھے لیکن کچھ عرصہ قبل ان سے ہونے والی آخری ملاقات میں بھی وہ ذہنی سطح پر ویسے ہی چاک و چوبند تھے جیسا میں نے انھیں ۴۴ برس پہلے یونیورسٹی اورینٹل کالج کی سال پنجم کی پہلی کلاس لیتے وقت دیکھا تھا۔ ان کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے قائداعظم لائبریری کے ششماہی ادبی مجلّے ''مخزن'' کی مجلس ادارت کی میٹنگ ان کے گھر واقع ای ایم ای سوسائٹی میں رکھی گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس دن ان سے رخصت ہوتے وقت پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ اب شاید وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ حالاں کہ ان کی گفتگو، لہجے کی کاٹ، آواز کے تیور اور ذہن کی چستی میں اس خیال کو تائید دینے والی کوئی علامت نہیں تھی۔ بیماری اور فریکچر کے باوجود ان کا غیر معمولی طور پر بھاری بھرکم وجود اب بھی محفل میں ان کو نمایاں کر رہا تھا اور ان کی حس مزاح بھی حسب معمول پورے جوبن پر تھی۔

حس مزاح سے یاد آیا کہ اتنی ڈگریوں، تصانیف اور علم کے بوجھ کے باوجود ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی یہ خوش مزاجی ہی تھی۔ وہ نہ صرف کہنے کے ساتھ ساتھ جملہ سہنے کی تاب بھی رکھتے بلکہ ایک اچھے سپورٹس مین کی طرح اپنی ہار کو کھیل کا حصہ سمجھ کر برداشت کرنے کی صلاحیت کے علاوہ اس پر ہنس سکنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ اردو کے محققین میں سوائے مشفق خواجہ کے، میں نے یہ خوبی کسی اور میں اس فراوانی سے نہیں دیکھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں حضرات کو فوٹو گرافی کا شوق بھی جنون کی حد تک تھا۔ اس بات میں بھی غالباً کوئی تیسرا محقق ان کا شریک نہیں۔ عام طور پر مرنے والوں کے لیے لکھی گئی تعزیتی تحریروں میں سوگ کی فضا کو برقرار رکھنے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی روح اپنی خوش مزاجی کے ذکر سے زیادہ محظوظ ہوگی، سو ان کے علمی کارناموں کے بیان سے پہلے آیئے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر کچھ بات کرتے ہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ جب وہ اسلامیہ کالج سول لائنز میں پڑھایا کرتے تھے تو ایک دن کوئی بہت شرارتی لڑکا اپنے ساتھ ایک کتے کا پلا لے آیا اور اسے ڈیسک کے خانے میں رکھ کر آگے اپنی کتابیں رکھ دیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے دبانے پر پلا بھونکتا اور ساری کلاس ہنسنے لگ جاتی۔ ڈاکٹر صاحب نے جلد ہی کتے کا سراغ لگا لیا لیکن متعلقہ لڑکے کو کوئی سزا دینے کے بجائے ایک ایسا جملہ کہا کہ آیندہ دو برس تک وہ کلاس میں بھیگی بلی بن کر بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا، ''بیٹا اسے کالج آفس میں لے جاؤ تمھاری آدھی فیس معاف ہو جائے گی۔''

خود ہی سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ وہ حسبِ معمول اپنے عظیم جثے کے ساتھ سکوٹر پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ کوئی پرانا شاگرد مل گیا، دعا سلام کے بعد بولا کہ ''سر یہ بڑی زیادتی ہے اتنا بڑا اور سینئر پروفیسر اور اس سکوٹر پر، آپ کے پاس تو بہت اچھی سی کار ہونی چاہیے۔''

ڈاکٹر صاحب نے بات ٹالنے کے لیے کہا، ''تم دعا کرو بیٹا، ان شاء اللہ کار بھی آ جائے گی۔''

''دعا تو آپ کا یہ سکوٹر ہی کرے گا سر، جس کی جان پر بنی ہوئی ہے'' لڑکے نے بے ساختہ کہا۔

ڈاکٹر صاحب کی آواز بہت کڑک دار تھی اور وہ بولتے بھی خاصے اونچے سر میں تھے۔ ایک دفعہ جب ان کے لیکچر کے دوران ان کی آواز پورے عروج پر تھی کلاس میں سب سے پہلی قطار میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے وجہ پوچھی تو کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی:

''سر آواز نہیں آ رہی۔''

ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو اس قدر انجوائے کیا کہ خوش ہو کر ساری کلاس کو چائے پلائی۔

ایک بار مرحوم قیوم نظر یونیورسٹی کی سیاست کے حوالے سے گلہ کر رہے تھے کہ آج کل لوگ سازشیں بہت کرنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا:

''معاف کیجیے گا قیوم نظر صاحب آپ نے اور ہم نے بھی ساری عمر اس کے سوا اور کیا کیا ہے۔''

باتیں تو اور بھی بہت سی ہیں مگر بعض جملوں کی نوعیت اور متعلقہ کرداروں کی نازک مزاجی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ انھیں یہاں درج کیا جائے نام کے اخفا کے ساتھ صرف ایک واقعہ سن لیجیے۔

ہمارے ایک سینئر ادیب کو زمانے اور حکومت سے اپنی ناقدری کا بہت گلہ رہتا تھا، اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وفات سے چند برس قبل ان کو تمغا برائے حسن کارکردگی مل گیا، کسی نے ڈاکٹر وحید صاحب سے کہا کہ چلیے اب ان کا گلہ تو ختم ہوا، حکومت نے اتنا بڑا انعام انھیں دے دیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے مسکراتے ہوئے کہا ''وہ تو بالکل خوش نہیں ہیں۔''

''کیوں'' ان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''ان کو گلہ ہے کہ یہ ایوارڈ اگلے سال کسی اور کو مل جائے گا'' ڈاکٹر وحید نے پکا سا منہ بنا کر کہا۔

اب اگر بطور استاد، نقاد، محقق اور ایڈمنسٹریٹر کے ان کے کارناموں اور خدمات پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش کی جائے تو یہ نظر رستے میں بار بار تھک کر رک جاتی ہے کہ یہ فہرست جتنی طویل ہے اس سے زیادہ شاندار ہے۔

مدرس نقادوں کے بارے میں عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ ان کی تنقیدی تحریریں گہرائی سے عاری اور سطحیت سے بھرپور ہوتی ہیں کہ ان کا مخاطب صحیح وہ طلبہ ہوتے ہیں جو ان کو نوٹس کی شکل میں استعمال کر کے امتحان پاس کرتے ہیں۔ ان میں مغز

کم اور تکرار زیادہ ہوتی ہے اور یہ لوگ رائے دینے کے ضمن میں اس قدر صلح کل اور تعلقات عامہ کے شکار ہوتے ہیں کہ ان کی پوری کتاب پڑھ جایئے آخر تک آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ یہ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔

احمد ندیم قاسمی مرحوم نے ایک بار ایک ایسے ہی مدرس نقاد کے حوالے سے ایک بہت دلچسپ واقعہ سنایا، کہنے لگے کہ جیل میں ہمارا مشقتی ایک دن ساگ کا ایک بہت بڑا گٹھڑا اٹھا کر لایا ہم کل پانچ آدمی تھے اور یہ ساگ چھوٹی موٹی بارات کے لیے کافی تھا۔ ہمارے استفسار پر اس نے بتایا کہ یہ ساگ کی ایک خاص قسم ہے جس کا ظاہری حجم زیادہ ہوتا ہے کٹنے کے بعد بھی یہ ساگ خاصے بڑے دیگچے کے اوپر تک پھیلا ہوا تھا لیکن ہماری حیرت کی حد نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ پکنے کے بعد وہ ساگ بہت کم ہو کر دیگچے کے ایک کونے میں سمٹ گیا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ہمارے ایک ساتھی نے بے ساختہ کہا:

''یار یہ تو پروفیسر فلاں کا تنقیدی مقالہ ہی نکلا۔''

لیکن ڈاکٹر وحید قریشی مدرس ہونے کے باوجود ایک اعلیٰ درجے کے نقاد اور محقق تھے۔ شروع شروع میں انھوں نے ''شبلی کی حیات معاشقہ'' جیسی کچھ چونکا دینے والی اور بقول شخصے قدرے فسادی تحریریں بھی لکھیں لیکن یہ شاید صرف اپنی طرف متوجہ کرنے کا ایک انداز تھا جس کی مثال ایک پرانے پنجابی فلمی گانے سے دی جا سکتی ہے جس کی ہیروئن ہیرو کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کہتی ہے کہ:

اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے
جھوٹھی موٹھی دا پا لیا ای ککھ وے
تے ساہڈے دل تک بجا

(ہم نے جان بوجھ کر آنکھ بند کر لی ہے اور اس میں جھوٹ موٹ کا تنکا پڑنے کا
بہانہ کر لیا ہے تاکہ اے ساجن تو ہماری طرف متوجہ ہو سکے)

لیکن یہ مثال ڈاکٹر وحید قریشی صاحب پر اس لیے صادق نہیں آتی کہ تقریباً نصف صدی پر پھیلا ہوا ان کا تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی کام اس قدر وسیع، متنوع اور اعلیٰ پائے کا ہے کہ ان کے بہت کم ہم عصر ان کی ہم سری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ بطور ایک ایڈمنسٹریٹر کے اورینٹل کالج کے پرنسپل اور پھر مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین کے طور پر بھی ان کی غیر معمولی انتظامی صلاحیتیں سامنے آئیں۔ انھوں نے اپنی کئی ہزار نایاب کتابوں پر مشتمل لائبریری تو اپنی زندگی میں ہی عطیہ کر دی تھی مگر آخری سانس تک ان کا زرخیز دماغ اور گوہر بار قلم اردو ادب کی خدمت میں مصروف رہا۔ وہ خود تو بھاری بھر کم تھے ہی مگر ان کے تصنیفی کام کا وزن بھی اپنی مثال آپ ہے۔

میرا ہم جماعت ۔ وحید قریشی

عنایت اللہ

مرحوم وحید قریشی اور میں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں طالب علم تھے۔ ہم جماعت تھے اور بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی ہم مکتب رہے۔

ہماری ایک قدر مشترک اردو زبان سے وابستگی تھی۔ کالج کے بعد میں تو سول سروس کا ہو کے رہ گیا اور وحید علم و ادب کی راہوں پر گامزن ہو گئے۔ وہ اورینٹل کالج کے پرنسپل بنے اور بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا۔ آخری دم تک وہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہے۔ درجنوں کتابیں تصنیف کیں اور کئی ایک تحقیقی رسائل کے ایڈیٹر بھی رہے۔ بڑھاپے میں بہت سی بیماریوں نے انھیں گھیر لیا مگر شعر و ادب سے ان کی وابستگی برابر قائم رہی۔ چلنے پھرنے سے معذوری کے باوجود انھوں نے کام نہ چھوڑا۔

کالج کے بعد گاہے گاہے لاہور اور اسلام آباد (جہاں وہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین تھے) میں ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مدرسے کی دوستی کا رشتہ اکثر بہت پکا ہوتا ہے۔ ہم کم کم ملے مگر ملاقات میں وہی پرانی بے تکلفی اور خلوص رہا۔ یہ متاع اب مرورِ زمانہ کے ہاتھوں کم ہوتی جا رہی ہے۔

جب بحیثیت ممبر قائداعظم لائبریری بورڈ آف گورنرز میں نے سال ۲۰۰۰ء میں 'مخزن' کو زندہ کرنے کا سوچا تو سب سے پہلے اپنے پرانے ہم جماعت عالم فاضل وحید قریشی سے مشورہ کیا۔ انھوں نے نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ میرے کہنے پر "مخزن" کی ادارت کی ذمہ داری قبول کرنے پر رضامندی بھی ظاہر کر دی۔ انھی کی مشاورت اور معاونت سے مخزن کا ایڈیٹوریل بورڈ تشکیل دیا گیا۔ یہ انھی کی فضیلت کا کمال تھا کہ "مخزن" کی مجلس میں سلیم اختر اور انور سدید شانہ بشانہ بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مخزن کے اٹھارہ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ مخزن کے مزاج اور معیار کو ہندو پاکستان کے ادبی اور علمی حلقوں میں سراہا گیا ہے۔ مجلّہ کی نمایاں حیثیت ڈاکٹر وحید قریشی کی مرہونِ منت ہے۔

ڈاکٹر وحید نے اردو تنقید و تحقیق میں نام کمایا۔ ادبی حلقوں میں ان کی ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' ان کا ایک کھلا تعارف تھا۔ انھوں نے مشہور اور قابلِ تعظیم استاد کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا۔ وہ نہ صرف بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، انھوں نے ہزاروں کی تعداد میں کتابیں جمع بھی کیں اور وفات سے پہلے ۳۵۰۰۰ قیمتی کتب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کی لائبریری کو بلا معاوضہ منتقل کر دیں۔

وحید کئی ایک اداروں کے سربراہ رہے۔ ان کو سنوارا اور نکھارا۔ ان میں اقبال اکیڈمی، بزمِ اقبال، مقتدرہ قومی زبان اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی ایک مضبوط محبِّ وطن پاکستانی تھے۔ پاکستان اور ہماری قومی زبان کی عزت و ناموس کے لیے ہمہ تن کمر بستہ رہے۔

وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ آخری ایام میں بستر پر لیٹے لیٹے انھوں نے سیکڑوں کی تعداد میں دوہوں کی صورت میں اشعار کہے۔ امید ہے ان کے ہونہار شاگرد اور رفقاء ان کو مرتب کر کے چھپوا دیں گے۔

مخزن کا ہر آنے والا شمارہ ہمیں ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت اور ان کی قابلِ قدر علمی اور تحقیقی تحریروں اور ان کی دیگر قیمتی خدمات کی یاد دلاتا رہے گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی

محمد حمزہ فاروقی

ڈاکٹر صاحب سے مراسم تین دہائیوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان تیس برسوں میں ہماری زندگیوں میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی دوست داری اور وضع داری تعلقات کی استواری کا موجب بنی۔ اس عرصے میں میں ان کے خلوص اور علم سے مستفید ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کی پسند و ناپسند شدید تھی۔ چناں چہ معاصر اساتذہ مثلاً ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ترقی پسند ادیبوں سے ان کے تعلقات خوش گوار نہ رہے، لیکن جن حضرات سے ایک دفعہ دوستی کر لیتے تو اسے حتی الامکان نبھاتے۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ عموماً ان کا رویہ بہت کریمانہ ہوتا تھا۔ آپ نہ صرف ان کے دکھ درد کے ساتھی تھے بلکہ چوری چھپے مالی امداد سے بھی دریغ نہ کرتے۔

جولائی ۱۹۷۹ء میں میں لندن سے آیا تو مشفق خواجہ نے ڈاکٹر صاحب کی کراچی آمد کی اطلاع دی۔ قیام خواجہ صاحب کے ہاں تھا۔ چوں کہ آپ علمی اور جسمانی اعتبار سے بھاری بھرکم تھے اس لیے نچلی منزل پر کتابوں کے ساتھ قیام کیا۔

شام کے وقت ملنے گیا تو بہت تپاک سے ملے۔ جب باتوں کے رنگا رنگ تھان کھلے تو اندازہ ہوا کہ آپ فارسی اور اردو ادبیات کے علاوہ برصغیر کی تہذیب اور تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اس پر مستزاد ان کی شگفتگی اور بزلہ سنجی تھی۔ ہم تینوں میں فوٹوگرافی کا ذوق مشترک تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا اس فن میں مطالعہ اور تجربہ خاصا وسیع تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ مجھے ادب کی کون سی صنف سے لگاؤ تھا؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے نثر سے دل چسپی تھی۔ انھوں نے نظم کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے عدم دل چسپی کا اظہار کیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ آپ کا ذوق تو خاصا Prosaic (نثری یا عدم تخیلاتی) ہے۔ فقرہ چست کرنے کے بعد طویل قہقہہ لگایا۔

ایک شام ہم کلفٹن گئے۔ دور تک سمندر کا نظارہ کیا اور دنیا جہان کے موضوعات پر باتیں کیں۔ واپس آنے لگے تو جہانگیر کوٹھاری پیریڈ پر انھیں سیپ کی آرائشی اشیا نظر آئیں۔ ان پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر صاحب کو اپنی بیٹی نورین کی یاد آئی اور انھوں نے ان کے لیے کچھ چیزیں خرید لیں۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء میں لاہور جانا ہوا تو سمن آباد میں ڈاکٹر صاحب کے گھر پر حاضری دینا بھی لازم جانا۔ ان کے ڈرائنگ روم میں سگار رکھنے کے لیے چمڑے کا ڈبا تھا جس پر مسجد قرطبہ کی تصویر ابھری تھی۔ میں اس سال فروری میں قرطبہ کی سیر کر چکا تھا۔

اس ڈبے کو یہاں دیکھ کر خاصا اچنبا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ان کے ایک دوست نے اندلس کی یاترا کے بعد یہ سوغات ان کی نذر کی تھی۔

کمرے میں عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر بھی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے چغتائی سے ذاتی مراسم تھے اور ان کا صلہ یہ تصویریں تھیں۔ آپ نے چغتائی کے اعلیٰ اخلاق اور روپے پیسے سے بے نیازی کا ذکر کیا۔ ان کے فن کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ چغتائی دوست احباب کے سامنے مصوری نہیں کرتے تھے۔ تکمیل کے بعد تصویر کو دھویا جاتا اور اس میں رنگ بھرے جاتے۔ یہ عمل کئی مرتبہ دہرایا جاتا تا آں کہ تصویر میں جان پڑ جاتی اور ہلکے اور گہرے رنگ نمایاں ہو جاتے۔ ان کے اسلوب کی تقلید بہت دشوار تھی۔

جنوری ۱۹۸۲ء میں میں لاہور گیا تو اس وقت ڈاکٹر صاحب اورینٹل کالج کے پرنسپل بن چکے تھے۔ کالج کے دفتر میں دوست احباب آپ کو گھیرے رہتے لیکن آپ باتوں کے دوران دفتری کام بھی نبٹاتے رہتے۔ میں صبح کے وقت پہنچا تو آپ سیکرٹری کو انگریزی میں خط املا کروا رہے تھے۔ اس میں ایک صاحب کا ذکر آیا جس نے مبنی بر دروغ واقعات پیش کیے تھے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کی انگریزی کی سوئی اٹک گئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت کے بعد عرض کیا کہ اس کے لیے Concocted Stories موزوں رہے گا۔ آپ نے شکریہ کے بعد اس اصلاح کو قبول کر لیا۔

میں ایک مرتبہ اورینٹل کالج گیا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے پروفیسر مرزا محمد منور سے ملوایا۔ ان کے ساتھی ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار شعبہ اردو سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر قریشی نے جب ان کا مجھ سے تعارف کرایا تو ذوالفقار صاحب کی مہم جوئی اور شمالی علاقوں کی سیاحت کا بطورِ خاص ذکر کیا۔

۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر صاحب مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین منتخب ہوئے۔ ان کے پیش رو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور میجر آفتاب حسن کے دورِ نظامت میں مقتدرہ کا مرکزی دفتر کراچی میں تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب کی تقرری عمل میں آئی تو فیصلہ ہوا کہ اسے اسلام آباد منتقل کیا جائے۔

وحید قریشی صاحب جب کراچی تشریف لائے تو میں اور مشفق خواجہ صاحب ان کے استقبال کے لیے ایرپورٹ پہنچے۔ یہاں انجمن ترقی اردو کے ارکان اور اردو کالج کے اساتذہ ڈھول تاشے سمیت جمع تھے لیکن ''ازلی ڈھنڈورچی'' جمیل الدین عالی اس منڈلی سے غائب تھے۔

کراچی میں ان کے اعزاز میں استقبالیہ جلسے منعقد ہوئے۔ ایسی ہی ایک تقریب میں پروفیسر جمیل اختر خاں نے افتتاحی تقریر میں ڈاکٹر صاحب کے علم و فضل اور ادبی خدمات کے بجائے ان کے بھاری بھرکم ہونے کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس طرح کے جملوں کا حساب بے باق کرنے میں خاصے بے باک تھے لیکن اس وقت آپ نے اپنی تقریر میں جمیل اختر خاں کو سرے سے نظر انداز کیا اور ملک میں نفاذِ اردو کے مسائل کا ذکر کیا۔

مقتدرہ کے دفتر کے ساتھ ڈاکٹر صاحب بھی اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ اس طرح انھوں نے اپنے وطن ثانی لاہور سے مفارقت گوارا کی۔ ڈاکٹر صاحب گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے لیکن لڑکپن کے دور میں لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے والد محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ ۱۹۸۵ء کے اوائل میں میں جب اسلام آباد گیا تو فون پر ان سے ملنے کی آرزو بیان کی۔ وقت مقررہ پر جب میں نے ان کا گھر تلاش کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اس شہر بے مثال میں مکانوں کے نمبر قرعہ اندازی سے تقسیم کیے گئے تھے۔ گلیوں کے نمبروں اور محلوں کی تقسیم میں انگریزی کے حروف تہجی اور ہندسے کام آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو فون پر دوبارہ زحمت دے کر ان کے گھر کی تلاش کا ہفت خواں طے کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب روایت مہمان نوازی اور خلوص کا اظہار کیا۔ وہ اسلام آباد سے زیادہ خوش نہ تھے۔ اسے زندگی کی حرارت سے محروم ''نوکر شاہی زدہ'' وسیع باغ یا جنگل قرار دیتے تھے لیکن نامساعد حالات کے باوجود آپ نے بڑے جذبے اور جوش کے ساتھ اردو کو قومی زبان بنانے کے لیے کام کیا۔ اپنے دور نظامت میں مختلف موضوعات پر کتابیں چھپوائیں۔

کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب کسی علمی تقریب میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لائے تو میں نے اپنے گھر پر ان کی دعوت کی۔ اس دعوت میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور مشفق خواجہ بھی شریک ہوئے۔ کھانے کے بعد مشفق خواجہ نے تجویز پیش کی کہ سالک کے ''افکار و حوادث'' کا انتخاب چھپنا چاہیے۔ اس کا اخبار کے فائلوں میں چھپا رہنا مناسب نہیں۔ ابن سالک (عبدالسلام خورشید) نے فرمایا کہ یہ کام میرے لیے ممکن نہیں، کیوں کہ اس کام کی رائلٹی میں ان کے بھائی عبدالرشید ارشد کو بھی شریک کرنا پڑے گا۔ دونوں بھائیوں کے تعلقات خوش گوار نہ تھے۔

وحید قریشی صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ خود یہ کام نہ کر سکیں تو اپنی نگرانی میں کسی شاگرد سے کام لیں۔ خورشید صاحب نے جواب دیا کہ فی الحال یہ بھی ممکن نہیں۔ قریشی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اس کام کا بیڑا اٹھاؤں۔ میں نے اس شرط پر آمادگی کا اظہار کیا کہ وحید قریشی صاحب اسے کسی ادارے میں شائع کروادیں۔ چناں چہ ''افکار و حوادث'' کی پہلی دو جلدیں ''مغربی پاکستان اردو اکیڈمی'' نے شائع کیں۔

دعوت کے بعد جب مہمان رخصت ہونے لگے تو میں نے ڈاکٹر قریشی صاحب کو سہارا دیا کہ وہ آرام سے جوتا پہن لیں۔ کفش پوشی سے فراغت کے بعد آپ نے فرمایا۔ فاروقی صاحب آپ نے ناحق زحمت کی۔ میں خود ہی جوتا پہن لیتا۔ میں نے جواب دیا: ''ڈاکٹر صاحب میں تو اپنے جوتوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں آپ میرے جوتے پہن کر نہ رخصت ہو جائیں۔'' یہ سن کر آپ مسکرادیے۔ آپ دوسروں پر اکثر فقرہ چست کرتے تھے لیکن اگر کوئی ان پر فقرہ چسپاں کرتا تو قہقہہ لگا کر داد دیتے تھے۔ ان کی خوش طبعی آخر دم تک برقرار رہی۔ سچ پوچھیے تو ان کی اس عادت نے ہجوم امراض و آلام میں انھیں جینے کا حوصلہ بخشا۔

ڈاکٹر صاحب مقتدرہ میں چند برس گزارنے کے بعد مستعفی ہو کر لاہور آ گئے۔ آپ نے بتایا کہ نوکر شاہی اردو کو قومی زبان منوانے کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ وہ اگر ''براکریسی'' کے اشاروں پر چلتے اور ''ناکارکردگی'' کا مظاہرہ کرتے تو اس ادارے

میں مزید کئی برس بتا دیتے۔ لیکن ان کے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ لاہور سے زیادہ عرصہ دور نہ رہ سکتے تھے۔

لاہور آنے کے بعد آپ نے اپنا ذخیرہ مخطوطات کسی علمی ادارے کو فروخت کرنا چاہا۔ خاصا عرصہ یہ ذخیرہ مشفق خواجہ کے گھر پر رہا لیکن خواجہ صاحب فروختگی کی مہم میں ناکام رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ انھیں واپس لاہور بھیج دیا جائے۔ ان کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے روایتی ذرائع ترسیل ناکافی و نامناسب تصور کیے گئے۔ جولائی ۱۹۸۹ء میں میرا لاہور جانے کا پروگرام بنا۔ خواجہ صاحب نے فون پر ڈاکٹر صاحب کو میرے ارادے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ان مخطوطات کو میرے ساتھ لاہور بھجوا دیں۔

لاہور پہنچا تو مون سون کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ لاہور میونسپلٹی نے یہ انتظام کیا تھا کہ اگر ابر رحمت برسے تو پانی ادھر ادھر نہ جائے بلکہ وہیں جمع ہوتا رہے۔ ان کی اس ''حکمت بے عملی'' کا خاطر خواہ اثر ہوا، سڑکیں اور گلیاں ندی نالوں میں تبدیل ہو گئیں۔ رکشا میں مرغابن کر سمن آباد پہنچا۔ خود بھیگتا رہا لیکن سوٹ کیس میں مخطوطات محفوظ رہے۔ گھر پر ڈاکٹر صاحب تو نہ ملے لیکن ان کے والد محترم مل گئے۔ امانت ان کے سپرد کر کے میں نے واپسی کی راہ لی۔

ڈاکٹر صاحب لاہور آئے تو ''بزم اقبال'' کے ناظم منتخب ہوئے۔ استاد محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کی یادگار ''مغربی پاکستان اردو اکیڈمی'' کو حیات نو بخشی۔ ''بزم اقبال'' کے دفتر میں درویش صفت ادیب محمد عبداللہ قریشی سے ملاقات ہوئی۔ آپ اس زمانے میں ماہ نامہ ''فنون'' کی ادارت میں احمد ندیم قاسمی کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ قاسمی اور وحید قریشی کے نظریات میں بعد المشرقین تھا لیکن عبداللہ قریشی کی مرنجاں مرنج طبیعت کا کمال ان دونوں سے مخلصانہ تعلقات سے ظاہر ہوتا تھا۔

عبداللہ قریشی ''حیات اقبال کی چند گم شدہ کڑیاں'' کے مصنف تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ ''قریشی صاحب! حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں (لڑکیاں) فراہم کر دیجیے۔'' قریشی صاحب مسکرائے اور فرمایا ''کتنی کڑیاں چاہییں؟'' میں نے جواب دیا: ''فی الحال ایک ہی کڑی کافی ہے۔''

ڈاکٹر وحید قریشی میں قوت عمل عام لوگوں سے کہیں زیادہ تھی۔ آپ نے ''بزم اقبال'' اور ''مغربی پاکستان اردو اکیڈمی'' سے بہت سی کتابیں شائع کیں لیکن معیار پر زور نہ دیا۔ چند کام کی کتابیں جو ان اداروں سے نکلیں، وہ غیر اہم کتابوں کے انبار تلے دب گئیں اور انھیں قارئین سے جائز پذیرائی نہ مل سکی۔

کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب ''اقبال اکادمی پاکستان'' میں بحیثیت ناظم متعین ہوئے۔ ''ایوان اقبال'' کے نشیمن بلند میں پہنچ کر آپ خاصے مطمئن نظر آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اچھے کھانوں کے شوقین تھے لیکن دوستوں کی تواضع میں انھیں زیادہ مزہ آتا۔ باتوں کے درمیان جب دوپہر ہو جاتی تو چپراسی کو آواز دی جاتی اور اسے گوال منڈی سے تلی ہوئی مچھلی لانے کا حکم دیا جاتا۔ انتظار کے لمحات ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں بیت جاتے۔ وہ لاہور کی آزادی کے بعد کی ادبی تحریکات کی زندہ تاریخ تھے۔ ان حکایات دل فریب میں وقت گزرنے کا احساس اس وقت ہوتا جب چپراسی میز پر مچھلی اور گرما گرم نان سجا دیتا۔ اس دعوت شیراز

میں ان کا اسٹاف بھی شریک ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب کے دو شوق ایسے تھے جن پر ذاتی ضروریات ترک کر کے ان کے حصول کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کا پہلا پیار کتابوں سے تھا، اس کے بعد اگر جیب اجازت دیتی تو فوٹو گرافی کی طرف مائل ہوتے۔ جس زمانے میں آپ اردو کے کلاسیکی ادب پر کام کر رہے تھے تو گرد آلود مخطوطات کی ورق گردانی کے دوران انھیں سانس کا عارضہ ہوا۔

بعض ڈاکٹروں کا ''مبلغ علیہ السلام'' اور عزرائیل علیہ السلام سے گہرا یارانہ تھا۔ چناں چہ وہ دونوں ہاتھوں سے تجوری اور مریضوں سے جنت بھرتے رہے۔ مریض اگر ان کے ہاتھوں سے بچ نکلتا تو یہ اس کی خوبیِ قسمت تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی پر جب دمہ کا غلبہ ہوتا تو ان کے معالج کورٹیزون استعمال کرواتے۔ اس سے وقتی طور پر آرام آ جاتا لیکن اثرات مابعد بہت شدید اور تلخ ہوتے۔ میں جب سفر یورپ پر نکلتا تو وہ پاکستان میں نایاب ادویہ کی فرمایش کرتے۔ مجھے ان کی جان اور اپنے روابط عزیز تھے اس لیے انکار کی مجال نہ تھی۔

ڈاکٹر صاحب معاملے کے کھرے تھے اور اپنے ماتحتوں سے دیانت و امانت کی پاسداری کی توقع رکھتے تھے۔ جن اداروں سے آپ بطور ناظم منسلک رہے اس کے ایک ایک پیسے کی حفاظت اپنا فرض گردانتے تھے۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کا دفتر ان کے گھر کے قریب سمن آباد میں تھا۔ یہ ڈاکٹر شجاع محمد ناموس کا مکان تھا جو ناموس صاحب کے انتقال کے بعد ان کی صاحبزادی کو منتقل ہوا تھا۔

برسوں سے یہ معمولی کرایے پر اکیڈمی کے مصرف میں تھا۔ مالکۂ مکان نے کرایے میں اضافے کی درخواست دی تو ڈاکٹر صاحب مجھے ساتھ لے کر دفتر گئے اور مالکہ سے ملاقات کی۔ ان خاتون کا مطالبہ تو بہت زیادہ اضافے کا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب اکیڈمی کے مالی حالات کے پیش نظر خاصی دیر ان سے بحث کرتے رہے۔ بحث کئی دلچسپ مقامات سے گزرنے کے بعد معمولی اضافے پر ختم ہوئی۔

نئی صدی کے آغاز پر تاجکستان کی ایک مجلس علمی نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ملک میں مدعو کیا۔ لاہور سے تاجکستان کے لیے براہ راست پرواز نہ تھی۔ جہاز کراچی سے دوشنبہ جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے روانگی سے قبل مجھے فون کر دیا۔ چناں چہ مقررہ وقت پر انھیں لینے کے لے ایئر پورٹ گیا۔ آپ ایک رات میرے پاس ٹھہر کر اگلی صبح دوشنبہ سدھارے۔ چند روز قیام کے بعد جب واپس آئے تو بہت خوش تھے اور تاجکوں کی مہمان نوازی اور علم دوستی کے گن گا رہے تھے۔ آپ نے بتایا کہ تاجکستان کی قومی زبان فارسی تھی لیکن سوویت دور میں اس کا رسم الخط سیریلک کر دیا گیا۔ اس طرح تاجک قوم کو قدیم تہذیبی ورثے سے بیگانہ کر دیا۔ آزادی کے بعد وہ رسم الخط کی تبدیلی پر غور کر رہے تھے۔ تاجک اس دبدھے میں تھے کہ لاطینی یا عربی رسم الخط میں سے کسے منتخب کریں۔ تاجک بند معاشرہ تھا۔ سوویٹ دور میں ان کے بیرونی دنیا سے روابط نہ تھے۔ آزادی کے بعد سے حالات بدلے تھے لیکن آمریت اور جبر نے تاجکوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھرنے نہ دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے بھرپور زندگی گزاری تھی، اس میں معاصرین میں معرکہ آرائی اور دوستوں کی پذیرائی دونوں ہی شامل تھیں۔ انھیں جہاں دوست داری کا فن آتا تھا، وہیں دشمن سازی میں بھی کمال حاصل تھا۔ انھیں فقرہ بازی کا شوق تھا۔ ان کا حریف طنزیہ ومزاحیہ فقرے سے سنبھلنے نہ پاتا کہ ڈاکٹر صاحب طویل قہقہہ لگا کر اس کے زخموں پر نمک چھڑکتے۔ فقرے بازی کے فن کو آپ نے اپنے کالموں جو "میر جملہ" کے قلمی نام سے لکھے گئے تھے، میں استعمال کیا۔ آپ ٹھیٹ پاکستانی تھے۔ ان کی ادیبوں اور شاعروں سے دوستی یا دشمنی بھی وطن کی بنیاد پر تھی لیکن آپ حریفوں سے مستقل دشمنی کے بجائے کنارہ کشی کو ترجیح دیتے۔

اقبال اکادمی پاکستان کے دوامی اراکین کا ایک حلقہ تھا جو ملک بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے از راہِ عنایت مجھے بھی اس کا رکن بنا دیا۔ یہ اراکین اپنے میں سے دو ارکان کو تین سال کے لیے بطور مندوب منتخب کرتے۔ مندوبین اکادمی کے انتظامی امور میں شریک کیے جاتے۔

ایک دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ خود کو بطور امیدوار پیش کروں۔ فون پر ڈاکٹر صاحب سے مشورہ طلب کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں یہ انتخاب نہ لڑوں۔ وہ خود بطور امیدوار کھڑے ہو رہے تھے، میں ان کی حمایت کروں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میں انتخاب میں کیوں حصہ نہ لوں؟ فرمایا: "آپ کو کوئی جانتا نہیں، آپ انتخاب ہار جائیں گے۔" میں نے عرض کیا "ڈاکٹر صاحب آپ کے ہارنے کا امکان زیادہ ہے۔" آپ نے دریافت کیا۔ "وہ کیسے؟" میں نے جواب دیا۔ "لوگ آپ کو جانتے ہیں، اس لیے آپ کا جیتنا محال ہے۔" میں نے انتخاب میں تو حصہ نہ لیا لیکن یہ مکالمات فریق مخالف نے اچک لیے اور انھیں ڈاکٹر صاحب کے خلاف استعمال کیا، لیکن اس کے باوجود آپ اپنے اثر ورسوخ سے انتخاب جیت گئے۔

انتقال سے چند سال پیشتر آپ شدید بیمار ہوئے۔ چلنا پھرنا موقوف ہوا اور زندگی ایک کمرے تک محدود ہو گئی۔ وہ اپنی قوت ارادی کے سہارے زندہ تھے۔ آپ نے سمن آباد کی رہائش ترک کر کے لاہور کے مضافات میں ایک پر فضا مقام پر واقع EME سوسائٹی میں بنگلہ بنوایا۔

میں جب ان سے ملنے نئی قیام گاہ پہنچا تو آپ بہت تپاک سے ملے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ کے دوستوں نے یہ مشہور کیا تھا کہ آپ کو "لاہور بدر" کر دیا گیا۔ اس پر آپ نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔ بیماری کے باوجود آپ ذہنی طور پر مستعد تھے۔ اور آپ کا قلم وکتاب سے رشتہ برقرار تھا۔ اس عالم میں بہت سی رباعیات کہی تھیں۔ ذاتی کتب خانہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کو منتقل ہو چکا تھا۔ جان لیوا بیماری میں وقفہ ہوتا تو "مخزن" کی ادارت فرماتے اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں لیکچر دیتے۔ یہ ان کی غیر معمولی قوت ارادی کا کرشمہ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد دور تک اس پایے کا عالم نظر نہیں آتا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی

صابر لودھی

ڈاکٹر وحید قریشی کو مرحوم لکھنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔ موت کا ذائقہ تو ہر نفس نے چکھنا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کیسے زندہ رہ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے جس حوصلے اور جوانمردی سے موت کا مقابلہ کیا، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ انھیں مقابل کو زیر کرنا اور اس کی شکست پر قہقہہ لگانا آتا ہے۔ ان کے پاؤں زمین پر جمے ہوئے تھے۔ کام کی لگن اور جینے کی امنگ انھیں گرنے نہیں دیتی تھی۔ وہ کئی قسم کی بیماریوں سے نبرد آزما ہو رہے تھے، جیے جا رہے تھے، تندرستی کے زمانے میں بھی ان کا یہی انداز تھا۔ اپنی ملازمت کی تمام ترقیاں انھوں نے اپنی جہد مسلسل سے حاصل کی تھیں۔ ان کا جسم اتفاقاً بھاری بھر کم تھا، انھیں کشتی لڑنے اور پچھاڑنے کا فن آتا تھا۔ پنجہ آزمائی کے بغیر کچھ پانے کی تمنا ان کے دل میں نہ تھی۔ علم کے حصول کی لگن اور مدمقابل سے زور آزمائی ان کے خمیر میں شامل تھی۔

ایک معروف علمی خانوادے سے نسبت کے سبب وہ علم دوست اور تخلیق کار تھے۔ والد محترم تھانیدار تھے بلکہ کئی دوسرے قریبی عزیز بھی پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے پولیس کا رنگ بھی ان پر چڑھا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے وقت نے انھیں تحقیق اور تعریض میں یکتا بنا دیا۔

زندہ لوگوں سے ''ہتھ جوڑی'' کرنے سے پہلے انھوں نے مرحومین میں سے علامہ شبلی نعمانی پر اپنا ہاتھ صاف کیا۔ عطیہ فیضی اور ان کی بڑی بہن فنون لطیفہ کی دلدادہ تھیں۔ روشن خیال دولت مند گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ بمبئی میں اپالو اور چوپاٹی کے ساحلوں پر ان کے بنگلے تھے۔ موسیقی، شاعری اور بزم آرائی سے رغبت نے ذہین و فطین لوگوں کو، ان کی میزبانی سے شرف یاب ہونے کا موقع فراہم کیا۔ بمبئی کے انھیں بنگلوں میں شبلی نعمانی بھی مہمان رہے۔ اپنے قیام کے دوران شبلی نے کئی غزلیں تخلیق کیں جن میں ایک غزل جو حافظ شیرازی کی زمین میں تھی، بہت مقبول ہوئی۔ اس غزل کا ایک شعر ہے:

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب چوپائی و گلگشت اپالو را

اس طرح شبلی نعمانی اور عطیہ فیضی کے روابط کی کڑیاں موجود تھیں۔ انھیں یکجا کرنے کے لیے کسی حوصلہ مند محقق کی ضرورت تھی جسے وحید قریشی نے پورا کر دیا۔ تحقیق کے میدان میں یہ ان کی پہلی کاوش تھی۔ اسی کے ساتھ وہ راتوں رات ''شبلی کی حیات معاشقہ'' والے وحید قریشی بن گئے۔

شبلی کے بعد ان کی نظر الطاف حسین حالی پر پڑی۔ حالی کی شخصیت وحید قریشی کو بہت محبوب تھی۔ لیکن حالی کے ''مقدمہ

شعروشاعری'' میں انھیں خامیاں نظر آئیں۔ انھوں نے 'مقدمے' کے مآخذ زمانہ طالب علمی میں تلاش کر لیے تھے۔ اس لیے ''مقدمے'' کے متن پر فوری توجہ مرکوز کی۔ اس کے حواشی لکھے۔ انگریزی کی اصل اصطلاحات کا موازنہ حالی کی اصطلاحات سے کیا اور اس طرح اپنی تحقیق اور تدوین دونوں کی دھاک بٹھادی۔

پھر میر حسن کی مثنوی ''سحرالبیان'' کے رومانی قصے نے انھیں مجبور کیا کہ وہ میر حسن کی دوسری مثنویاں بھی پڑھیں۔ کئی مثنویاں ایسی تھیں جو میر حسن کے نام سے موسوم تھیں۔ اصلی اور جعلی مثنویوں کے مطالعے نے میر حسن کے کام پر تحقیق کرنے کا جذبہ بیدار کیا۔ اس طرح وحید قریشی کے ہاتھوں میر حسن کو حیات جاوید ملی۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' اردو نثر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ وحید قریشی اس سنگ میل پر توجہ دیے بغیر آگے کیسے بڑھتے؟ انھوں نے میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار'' پر ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس سنگ میل کو عبور کیا اور محاکمہ کا کمال دکھادیا۔

راستے میں رک کے دم لینے کی عادت ان میں نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے انبار لگا دیے۔ تحسینی اور مکتبی تنقید ان کے مزاج میں شامل نہ تھی۔ اس لیے ان کے مضامین اور مقدموں میں جدت اور تنوع کی خوبیاں موجود ہیں۔ تاہم یہ ان کی نظر کی خوبی ہے جو ہر بڑے فن پارے میں خامی تلاش کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک بار مجھے بتایا کہ مظفر علی سید سے میرے ایک ساتھی نے پوچھا کہ وحید قریشی صاحب نے ہر بڑی شخصیت کے فن کا مطالعہ کیا ہے اور ان پر لکھا ہے۔ سودا، میر حسن، آتش، غالب، داغ، میر امن، سرسید، حالی، لیکن انھوں نے ابھی تک میر تقی میر کی شاعری پر کچھ نہیں لکھا۔ مظفر علی سید نے جواب دیا: ''ڈاکٹر صاحب کی نظر میر کی کسی خامی پر نہیں پڑی۔ پڑی ہوتی تو وہ اب تک لکھ چکے ہوتے۔''

گزشتہ صدی کی ساٹھویں اور سترویں دہائیوں میں شاعر اور ادیب دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ دائیں بازو کے ادیب اور بائیں بازو کے ادیب۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا شمار دائیں بازو کے ادیبوں میں ہوتا تھا۔ اس لیے ان کی تنقید کی شمشیر بے نیام بائیں بازو کے ادیبوں پر چلتی۔ ہفت روزہ ''زندگی'' میں ترقی پسندوں کے خلاف مضامین لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا اس میں سید وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کو زچ کرنا بھی مقصود تھا۔ وحید قریشی انتہائی عرق ریزی سے اپنے مواد کو ترتیب دیتے، ناقابل تردید شواہد (حوالے) سامنے لاتے اور اپنے ہم خیال ادیبوں اور دوستوں سے داد پاتے۔ ان کے چہرے پر فتح مندی کی ایسی چمک پھیلتی جیسے کوئی پولیس اہل کار مجرم سے سچ اگلوا لینے کے بعد مسکراتا ہے۔

زبردست کو زیردست کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ کوئی نئی تحریک یا کوئی رجحان سامنے آتا، وحید قریشی اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کا اہتمام کرنے لگتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ''ادبی دنیا'' اور ''اوراق'' میں انشائیہ نگاری کی تحریک چلائی اور انشائیے کے خدوخال اجاگر کرنے کی سعی کی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے دنوں میں انشائیہ کی تاریخ مرتب کر دی۔ سرسید احمد خاں کے دبستان سے لے کر عصر حاضر تک کے ایسے ایسے نثر پارے جمع کیے جن پر انشائیہ ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ ثابت یہ کیا کہ انشائیہ پر سر کھپانے کی ضرورت نہیں، انشائیہ تو ہر اچھے نثر پارے میں چھپا ہوتا ہے۔

معتبر اور مستند محققین کے کام کا محاکمہ تو ان کا بنیادی کام تھا، ان کے مزاج سے لگا بھی کھاتا تھا۔ لیکن وہ غیر معتبر اور غیر مستند

نقادوں کو بھی بڑھاوا دیتے رہتے کہ چند کلمۂ خیر کہنے والے ان کے دائرۂ احباب میں شامل رہیں۔ جنسی موضوع پر لکھنے والوں کو نفسیاتی نقاد قرار دینا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ ان لوگوں پر مہربان ہوتے جو ان کی پناہ میں آجاتے یا پھر جن کو وہ اپنا ہم خیال تصور کرتے (اکثر یہ ان کی خام خیالی ہوتی) جتنی عمدگی اور توجہ سے وہ ادب کے کلاسیکی سرمایے کا مطالعہ کرتے، مردم شناسی میں وہ اتنا ہی کمزور تھے۔ جب وہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین تھے، ان کے داد و دہش کے چرچے عام تھے۔ انھوں نے لکھنے والوں کو معقول معاوضے پر اتنا کام دیا کہ ان سے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ سول سروس کے امتحان میں ایسا نصاب شامل کروایا جسے امیدوار مجبوراً پڑھتے بھی ہیں اور غیر معیاری ہونے کا ماتم بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی یہ رائے حرف بحرف درست ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایم۔اے (اردو) کو سستا کیا جب کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے پی ایچ ڈی کی قیمت گرادی۔ ستر کی دہائی میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اورینٹل کالج کے لان میں قناتیں لگوا کر سو ڈیڑھ سو طلبہ کو کلاس میں جمع کرلیا تھا۔ وحید قریشی کی خواہش تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ ڈاکٹریٹ کی تعداد بڑھائیں۔ جو موضوع ان کے ہاتھ لگتا اسے اپنے کسی شاگرد کو بخش دیتے۔ عبدالحمید عدم کا انتقال ہوئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک طالبہ ان کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے بلایا اور کہا: ''لو بھئی آپ کا مسئلہ حل ہوگیا۔ عدم پر خاکہ تیار کرکے فوراً پیش کرو اور ڈاکٹر بن جاؤ۔'' طالبہ نے حکم کی تعمیل کی اور چند سال کی محنت کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلی۔ ایک بار مجھ پر بھی مہربان ہوئے۔ کہنے لگے:

''تم نے ایسوسی ایشن کے کاموں میں بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ مستقبل میں ایم۔اے کی کوئی قدر نہ ہوگی۔
اثر صہبائی پر پی ایچ ڈی کرلو۔ بڑا آسان کام ہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا:

''میں مشکل پسند کرتا ہوں۔ ان کے بیٹے سرمد صہبائی پر کیوں نہ کروں؟''

قہقہہ لگا کر کہنے لگے:

''بہر حال یہ یاد رکھنا، آیندہ پی ایچ ڈی ہی کام آئے گی۔''

ان کا اندازہ بالکل درست تھا۔ جن لوگوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، وہی آگے بڑھے۔ صرف ایم۔اے پر تکیہ کرنے والے قابل ترین اساتذہ منہ دیکھتے رہ گئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی شاعر بھی بہت اچھے تھے۔ ان کے کلام میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ زبان کی فصاحت بھی موجود ہے لیکن ان کی تحقیق ان کی شاعری پر غالب آگئی۔ وہ فوٹو گرافر بھی بہت اچھے تھے۔ ان کی ریٹائرمنٹ تک ان کا کیمرا، ان کی میز پر ہوتا تھا۔ ملنے والوں میں سے جس شخصیت کے خدوخال انھیں متاثر کرتے، کیمرا اٹھا کر اس کی تصویر کھینچ لیتے۔ ایک بار انھوں نے میرے چہرے کی اداسی کو بھی اپنے کیمرے میں محفوظ کرلیا تھا۔

مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن مختلف انجمنوں میں ان کی مربوط گفتگو سن کر اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھے استاد

بھی ہوں گے۔ ان کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ اس لیے ان کے لیکچر انتہائی مدلل اور معلوماتی ہوں گے۔ مجھے ان کی ریڈیائی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایسا لگتا تھا وہ فی البدیہہ گفتگو نہیں کر رہے، کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر ان کی باتیں سن کر مجھے اس لیے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ لمبے عرصے تک آنکھیں جھپکے بغیر بولتے چلے جاتے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ میں علامہ علاء الدین صدیقی، پروفیسر قیوم نظر اور ڈاکٹر وحید قریشی نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان سے ہم کلام ہو کر لطف آتا تھا۔ قیوم نظر فقرے کے ساتھ ایک زوردار قہقہہ بھی نذر کرتے تھے اور ڈاکٹر وحید قریشی کو اپنے فقرے کی نوک پلک سنوارنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ حفیظ جالندھری کے اس فرمان پر عمل کرتے تھے کہ ذہن میں اترا ہوا فقرہ نہ جائے، دوستی بے شک چلی جائے۔ جب وحید قریشی اسلامیہ کالج میں (سول لائنز) میں پڑھاتے تھے تو ان کی اور پروفیسر منہاج الدین کی کوششوں سے کالج کی بزم ادب کے بھرپور اجلاس ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی اور پروفیسر نذیر احمد مرحوم (جو اس وقت ایم۔اے انگریزی کے طالب علم تھے) تخلیق پاروں پر تنقید کرنے میں سب سے آگے تھے۔ ایک اور نوجوان جسے ڈاکٹر وحید قریشی کے موٹاپے پر اعتراض تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید پر یوں گویا ہوتا تھا۔ ''ہم ڈاکٹر صاحب کی بھاری بھرکم شخصیت کا احترام کرتے ہیں مگر......'' جب اس قسم کا جملہ اس نے دو تین بار دہرایا تو ڈاکٹر صاحب سے نہ رہا گیا۔ تمام احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے پنجابی میں کہنے لگے: ''یار! ایہہ گل مینوں سمجھ نہیں آوندی، پئی دو بندیاں نوں میری بھاری شخصیت کیوں بھیڑی لگدی اے۔ اک ایہہ جوان، دوجی میری بیوی۔''

ہمارے عہد میں تین شخصیات ایسی ہیں جن کا مطالعہ لامحدود ہے۔ عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وحید قریشی (جو اب ہم میں نہیں) کوئی مطبوعہ کتاب، کوئی رسالہ، اخبار کا ادبی صفحہ ایسا نہیں ہو سکتا جو ان کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ وہ مطبوعہ مواد کو پڑھتے ہی نہیں اس پر اپنا تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی میں ایک اضافی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دنیا کی خبر بھی رکھتے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں پبلک سروس کمیشن کا ریزلٹ ابھی نہیں آیا تھا۔ میں اوکاڑے میں لیکچرر تھا۔ اتفاقاً لاہور میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ یہ میری ان سے دوسری یا تیسری ملاقات تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگے۔ ''جاؤ بھئی بہاولنگر، جی ایم اثر کو فارغ کرو۔ تمھاری سلیکشن ہو چکی۔'' لطیفہ یہ ہے کہ پروفیسر جی ایم اثر کو بوجوہ گورنمنٹ کالج لاہور سے بہاولنگر تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا اشارا اسی جانب تھا۔

میں نے عرض کیا اگر آپ کی خبر مصدقہ ہے تو میں اثر صاحب کی جگہ لینے بہاولنگر تو ہرگز نہ جاؤں گا۔ میں ریلوے لائن پر کوئی سٹیشن تلاش کروں گا۔ (خدا نے جلد ہی مجھے گورنمنٹ کالج ساہیوال کا پروانہ دلوا دیا)۔

انتظامی امور میں ان کی صلاحیتیں بے مثال تھیں، البتہ ان کے مزاج پر تھانیداری غالب آ جاتی تھی۔ پولیس کے مزاج کی ایک خوبی یہ ہے کہ انتہائی نرم اور تعمیری ہونے کے باوجود اس میں تخریب کی ایک لہر ہمیشہ جاری و ساری رہتی ہے۔ انھوں نے تمام عمر رزق حلال کھایا۔ دیانت اور ذمہ داری سے اپنے فرائض منصبی نبھائے لیکن 'دبا کے رکھنے' کے شوق میں مخالفت کا مقابلہ بھی کیا۔ اوری اینٹل کالج تو خیر ایک مشکل ادارہ ہے۔ کسی کو ''دبا کے رکھنا'' مشکل ہی نہیں ناممکن ہے:

جو ذرہ جس جگہ پہ ہے وہیں آفتاب ہے

ڈاکٹر وحید قریشی نے بطور صدر شعبہ اور بطور پرنسپل تحقیقی کام پر بھرپور توجہ دی۔ ان کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کا موقع اس وقت ملا جب وہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین اور اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر بنے۔ انھوں نے ان دونوں اداروں کو فعال اور منفعت بخش ادارے بنا دیا۔ خود شب و روز محنت کی اور دوسروں سے کام لیا۔ انھیں 'انفراسٹرکچر' کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ آج یہ دونوں ادارے اپنی اہمیت اور ضرورت برقرار رکھے ہوئے ہیں تو یہ ڈاکٹر وحید قریشی کی محنت کا ثمر ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور (جو اب یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر چکا ہے) اس اعتبار سے بہت خوش قسمت ہے کہ اس کی لائبریری میں نامور لوگوں کے کتب خانے شامل ہو گئے ہیں۔ سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، صوفی تبسم، پروفیسر قیوم نظر اور بہت سے دوسرے راوینز لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے ۳۵ ہزار کتب اور رسائل پر مشتمل اپنا قیمتی کتب خانہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کو دان کر دیا۔ کئی اداروں نے اس کتب خانے کو بھاری رقم کے بدلے خریدنا چاہا۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب وحید قریشی کو پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ وہ کئی امراض کا مقابلہ کر رہے تھے اور بیماریوں پر پیسا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

انتقال سے دو ہفتے پہلے تک وہ اپنے طلبہ کی رہنمائی کرتے رہے۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی نے ڈاکٹر وحید قریشی کو سینئر پروفیسر کا اعزاز بخشا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وحید قریشی کا اس ادارے پر احسان تھا کہ وہ ہر ہفتے، بدھ کے روز یونی ورسٹی پہنچتے۔ فارسی شعبے کی لائبریری میں قیام کرتے اور طلبہ ان سے فیضیاب ہوتے۔ ادب کی پوری تاریخ انھیں زبانی یاد تھی۔

غالباً ساٹھ کی دہائی کی بات ہے۔ پاک ٹی ہاؤس میں ڈاکٹر صفدر حسین، ڈاکٹر وحید قریشی سے دبستان لکھنو کی شاعری کے بارے میں سوال پوچھ رہے تھے۔ چند دن پہلے ڈاکٹر صفدر حسین نے لکھنو کے مراثی پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ جمع کروایا تھا۔ اسی حوالے سے چند سوال ان کے ذہن میں تھے۔ قیوم نظر توجہ سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ محفل برخاست ہوئی تو ڈاکٹر صفدر نے قیوم نظر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بھئی! وحید قریشی نے تو میرے اکثر تاریخی حوالے مشکوک کر دیے۔''

اب وحید قریشی اپنے تحقیقی کاموں میں موجود ہیں اور زندہ ہیں۔ ادب پر تحقیقی کام کرنے والے، مجلسی زندگی سے تعلق رکھنے والے، وحید قریشی کو بھلا کر ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں سے استفادہ کریں انھیں ڈاکٹر وحید قریشی نا امید نہیں کریں گے۔

حواشی

۱؎ حافظ شیرازی کا شعر تھا

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلی را

ادب و تحقیق کا جن...... وحید قریشی

ڈاکٹر ریاض قدیر

جب ۱۹۷۸ء میں مجھے وحید قریشی صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا تو اس وقت ان کی عمر ۵۸ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ جوانی کا حال معلوم نہیں مگر اس ادھیڑ عمری میں ان کا جسم ایک ایسے بوڑھے پہلوان کا نقشہ پیش کر رہا تھا جو جوانی کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہو، سانس پھولا ہوا، کلاس روم میں آتے ہی ہانپ کر کرسی پر گر پڑتے بلکہ کرسی میں دھنس جاتے تھے۔ کرسی سے اٹھنا، بیٹھنے کے عمل سے بھی زیادہ مشکل اور زور آور مرحلہ ہوتا تھا۔ اکھڑے ہوئے سانس کے باوجود لہجے میں اعتماد اور تمکنت تھی۔ نظروں میں ذہانت کی چمک اور جستجو کی ایسی طراری کہ مخاطب مرعوب ہو جاتا۔ لیکچر شروع ہوتا تو سانس کی آمد و رفت اور لہجے کے گھن گھرج سے کمرائے جماعت میں ایک طوفاں کا سماں پیدا ہو جاتا۔ علم اور دلائل کا سیلاب سامعین کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا۔ علوم و فنون، منطقی دلائل، تاریخی واقعات اور ادب پاروں کے متون کے حوالوں کی بھرمار سے سامعین پسپا سے ہو جاتے۔ دوسروں کو پسپا کرنا وحید قریشی کی شخصیت کا خاص وصف تھا۔ مخاطب کو زیر کر کے لطف لیتے طاقت اور مسابقت ان کی شخصیت کے دو بنیادی عناصر تھے۔ طاقت کا حصول اور مسابقت کی رزم گاہ میں طاقت آزمائی، ان کی زندگی انہی دو مشاغل کی رزمیہ داستان ہے جس میں قصہ در قصہ کئی کہانیاں اور کئی واقعات شامل ہوتے چلے گئے۔ حصول طاقت کا جذبہ جنون کی حد تک تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے عرصہ ملازمت میں وہ پرنسپل اوری اینٹل کالج، ڈین آف آرٹس، چیئرمین یونیورسٹی لائبریری، ممبر سینٹ، ممبر سنڈیکیٹ، ممبر بورڈ آف ہائر سٹڈیز سمیت کم و بیش دو درجن انتظامی کمیٹیوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے شامل رہے اور اگر انھیں یونیورسٹی کے درجہ چہارم کے ملازمین کا انچارج بھی بنا دیا جاتا تو وہ بخوشی اس ''عہدہ'' کو قبول کر لیتے۔

اپنی طاقت کے اظہار کے لیے وہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنے لیے خود ہی میدان کارزار تیار کر لیتے تھے۔ پہلوانوں کا شہر گوجرانوالہ وحید صاحب کا آبائی علاقہ ہے۔ پنجہ آزمائی کا یہ شوق اس شہر کی آب و ہوا اور ماحول کا نتیجہ تھا یا کوئی جینیاتی وجہ تھی کہ وحید صاحب اپنے اردگرد کے انسانوں سے نبرد آزما ہونے میں لطف محسوس کرتے تھے اور اس کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

وحید صاحب ہر شخص کو اپنا حریف خیال کرتے تھے، ان کے لاشعور میں شکست کا شدید خوف تھا لہٰذا وہ اپنے مدمقابل پر پیشگی حملہ کر دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی اکثر جنگیں ہار جانے کے خوف سے جیتی گئی ہیں۔ وحید صاحب نے بھی اپنی زندگی میں بہت سی جنگیں لڑیں اور اکثر جنگیں اسی لاشعوری خوف شکست کی وجہ سے جیتیں، جن لوگوں کو بھی وحید صاحب اور ان کے قلم سے واسطہ پڑا وحید

صاحب نے انھیں پسپا کر دیا۔ بعض اوقات ان کے قریبی احباب اور شرفا بھی ان کے حملوں کی زد میں آ جاتے تھے مگر وحید صاحب اس کی پروانہ کرتے۔ ان کی بعض تحریریں بھی ان کے اسی جذبۂ پیکار کی عکاسی کرتی ہیں۔ ''مقدمہ شعر و شاعری''، ''نقدِ حالی'' اور ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' اردو میں بے لاگ اور بے رحم تنقید کی عمدہ مثالیں ہیں مگر ان میں شریف انسانوں کی جس طرح پگڑی اچھالی گئی ہے اس سے عیاں ہوتا ہے کہ ''نقاد'' نے اپنے کسی لاشعوری جذبے کو تسکین بہم پہنچانے کا سامان بھی کیا ہے۔ ان کے اسی ''جذبے'' کے ہاتھوں ان کے کئی رفقائے کار اور شاگرد عمر بھر زخم چاٹتے رہے۔ مگر وحید صاحب کی تشفی تو حملہ آور ہونے ہی سے ہوتی تھی اور یہ رزمیہ حربے ان کے نزدیک لہو گرم رکھنے کا بہانہ اور موجبِ حیات تھے۔ ان کی جھپٹنے پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کی ''خوئے شاہینی'' کا مجھے ذاتی طور بھی تجربہ ہوا۔ ہوا یوں کہ ایم۔ اے اردو کے زمانہ طالب علمی کے دوران میں ڈاکٹر وزیر آغا کے صاحبزادے سلیم آغا قزلباش کے علاوہ راؤ ذوالفقار علی فرخ (پروڈیوسر پاکستان ٹیلی ویژن) بھی میرے ہم جماعت تھے۔ ہم تینوں کا شمار ممتاز طلبہ میں ہوتا تھا۔ سمسٹر سسٹم تھا، میں پہلے سمسٹر میں اول پوزیشن حاصل کر چکا تھا۔ راؤ ذوالفقار علی دوسرے سمسٹر میں اول رہے جب کہ سلیم آغا تیسرے نمبر پر تھے۔ تیسرے سمسٹر میں وحید صاحب نے مجھے اور راؤ ذوالفقار علی کو Assignment Work میں فیل کر دیا اور سلیم آغا کو نوے فی صد نمبر ایوارڈ کر دیے، لہٰذا سلیم آغا اول قرار پائے۔ سمسٹر سسٹم میں استاد کا لکھا ہوا حرفِ آخر ہوتا ہے۔ پرنسپل اور ڈین کے عہدوں پر خود وحید صاحب فائز تھے، فریاد کہاں کرتے، پھڑ پھڑا کر خاموش ہو رہے۔

۱۹۸۰ء میں ایم۔ اے اردو کا امتحان پاس کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں لاہور سے دور چلا گیا اور کئی سال تک وحید قریشی صاحب سے نہ تو ملاقات ہوئی اور نہ ہی میں نے ملنے کی کوشش کی۔ سولہ سال بعد ۱۹۹۶ء میں میں نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے سے متعلق بعض معلومات حاصل کرنے کے لیے وحید صاحب سے رابطہ کیا۔ انھوں نے نہ صرف پہچان لیا بلکہ حوصلہ افزائی کے ساتھ میرے موضوعِ تحقیق سے متعلق نہایت نادر اور مفید معلومات بھی بہم پہنچائیں۔ اس طرح وحید صاحب سے از سرِ نو رابطہ ہو گیا اور پھر ان کی وفات تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور ان کی شخصیت کے مزید کئی رخ دیکھنے کو ملے۔ اپنی عمر کے آخری دور میں وحید قریشی قدرے بدل گئے تھے۔ مسابقت اور محاذ آرائی کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا، مگر علالت کے باوجود زندگی اور اس کے متعلقات سے وحید صاحب کی دلچسپی اور وابستگی جوں کی توں رہی۔ خاص طور پر اپنی کتابوں اور کاغذات سے ان کی محبت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ ہر طرح کی کتابیں اور کاغذات (خطوط اور سرکاری نوٹیفکیشن وغیرہ) کے انبار لگا رکھے تھے۔ کتب کی تعداد تقریباً چالیس ہزار کے قریب تھی۔ آپ ان کے گھر جا کر کتابیں دیکھ سکتے ہیں مگر کسی کو کتاب لینے یا لے جانے کی اجازت نہ دیتے۔ آخر دم تک کتابیں خریدتے رہے۔ احباب اور شاگردوں سے فرمائش کر کے کتابیں حاصل کرتے مگر اپنی کتاب کسی کو نہ دیتے۔

۲۰۰۵ء کے موسم گرما کا دن تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے کاغذات وغیرہ ترتیب دینے کے لیے بلایا۔ کام کے دوران ایک فائل جس میں ہم عصر مشاہیر اور ادیبوں کے خطوط تھے میرے ہاتھ سے گر پڑی اور کاغذات فرش پر بکھر گئے۔ وحید صاحب برہم ہو گئے اور ایک بچے کی طرح بلبلانے لگے ''ہائے میرے کاغذات خراب کر دیے'' حالاں کہ کاغذات خراب ہرگز نہ ہوئے تھے صرف منتشر ہو

گئے تھے۔ میں نے بکھرے ہوئے کاغذات کو نہایت احتیاط سے ترتیب دیا اور انھیں فائل میں محفوظ کر دیا۔ جب میں یہ کام کر چکا تو انھیں کچھ تسلی ہوئی اور دم میں دم آیا۔ اس دن مجھے یوں لگا کہ جیسے تحقیق کے اس جن کی جان ان کاغذوں میں ہو اور ان کے بکھرنے سے وحید صاحب کی جان پر بن آئی ہو۔

وحید صاحب اپنی پرانی سی پرانی اور از کار رفتہ اشیا کو بھی سینت سینت کر رکھتے تھے۔ گھر کے علاوہ دفتر کے کاغذات اور اشیا کے ساتھ بھی ان کا یہی برتاؤ تھا۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے زندگی بھر کسی بھی چیز کو بے کار سمجھ کر نہیں پھینکا۔

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے دفتر کا فرنیچر جو اکیڈمی کی تاسیس کے وقت ربع صدی قبل خریدا گیا تھا وحید صاحب نے اسے مرتے دم تک سینے سے لگائے رکھا۔ ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، میزیں، بینچ اور الماریاں جو اکیڈمی کے رجسٹر میں ان ناموں سے درج تھیں مگر عملی طور پر لکڑیوں، پلاسٹک کے ٹکڑوں اور لوہے کی سلاخوں کا ڈھیر بن چکی تھیں، وحید صاحب نے انھیں محفوظ کر رکھا تھا۔ ان کے خیال میں یہ اکیڈمی کا نہایت قیمتی اثاثہ تھا۔ گزشتہ چند سالوں میں اکیڈمی کا اپنا دفتر تین چار جگہوں پر تبدیل کرنا پڑا تو یہ کاٹھ کباڑ کتابوں کے ساتھ ٹرکوں پر لادا جاتا اور ان کی قیمت سے زیادہ ان کا کرایہ اکیڈمی کو ادا کرنا پڑتا۔ اس پرانے فرنیچر کے کرایہ پر اٹھنے والی رقم سے اسی قدر نیا فرنیچر خریدا جا سکتا تھا مگر وحید صاحب کو پرانی اشیا سے اس قدر محبت تھی کہ انھیں کسی صورت Dispose Off کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔

ہر شخص اور ہر کاغذ کو شک کی نظر سے دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر کسی بھی مسودے میں موجود اغلاط پر فوراً پہنچ جاتی۔ کسی سے کوئی بھی معاملہ کرتے وقت ان کے ذہن میں پہلا خیال یہ آتا تھا کہ کہیں انھیں دھوکا تو نہیں دیا جا رہا۔ چیزوں کو شک کی نظر سے دیکھنا عیوب کی تلاش میں رہنا اور بے مروت ہونا، اخلاقی نقطہ نظر سے انسانی خامیاں متصور ہوتی ہیں مگر ایک محقق میں ان باتوں کا پایا جانا اس کی خوبیاں سمجھا جائے گا کیوں کہ تحقیق کا آغاز ہی شک سے ہوتا ہے، تفتیش، کھوج اور جستجو تحقیق کو پروان چڑھاتی ہیں اور قوت تجزیہ سے درست نتائج کا استخراج تحقیق کے عمل کی تکمیل کرتا ہے۔ مروت محقق کو سچ کہنے سے روک سکتی ہے۔ کامیاب محقق بے مروت بھی ہوتا ہے۔ وحید قریشی چوں کہ طبعاً محقق واقع ہوئے تھے اور تحقیق ہی ان کی شخصیت کا مرکز (Nucleus) تھی۔ لہٰذا ان کی شخصیت میں یہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ علمی اہلیت اس پر مستزاد تھی۔ فارسی کا لسانی و ادبی شعور، تاریخ پر گہری نظر، انگریزی زبان و ادب پر دسترس، مقامی زبانوں خصوصاً پنجابی پر ان کی گرفت قابل رشک تھی۔ ان صلاحیتوں کا ارتکاز اور بھرپور استعمال انھیں بہت بڑا محقق بنا سکتا تھا۔ مگر وحید صاحب نے اپنی عمر عزیز اور جملہ صلاحیتوں کا بڑا حصہ مختلف انتظامی عہدوں کے حصول کے لیے لڑی جانے والی جنگوں میں ضائع کر دیا۔ اگر وہ اپنی ان صلاحیتوں کو یک جا کر کے تحقیق کے لیے وقف کر دیتے تو یقیناً اپنے استاد حافظ محمود شیرانی کے ہم پایہ محقق قرار پاتے۔ تاہم وحید صاحب کے موجود تحقیقی سرمایے میں ''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ''، ''میر حسن اور ان کا عہد''، ''اقبال اور نئی قومی تشکیل'' اور تحقیقی مقالات، جیسی وقیع علمی تصانیف کی موجودگی کے باعث انھیں اردو تحقیق میں ممتاز اور نمایاں مقام دیا جاتا رہے گا۔

وحید قریشی صاحب تمام عمر اردو اور فروغ اردو کے لیے کام کرنے والے اداروں سے وابستہ رہے۔ پرنسپل اورینٹل کالج سے لے کر مقتدرہ قومی زبان کی چیئرمین شپ تک وہ جہاں بھی گئے انھوں نے اردو زبان وادب کی ترویج کے لیے بے شمار منصوبہ جات مرتب کیے اور ان پر کام بھی کروایا۔ بزم اقبال اور پاکستان اردو اکیڈمی کے محدود وسائل کے باوجود بیشتر اشاعتی پراجیکٹس کی تکمیل کی۔ وہ جہاں جاتے منصوبوں اور فائلوں کے دفتر کھول دیتے اور اپنی شخصیت کی توانائی Dynamic Personality سے ادارے میں جان ڈال دیتے۔ لوگوں کو کام پر اکسانا، ان سے لکھوانا اور پھر ادبی، تنقیدی اور تحقیقی تحریروں کی طباعت کے انتظامات کرنا وحید قریشی کا معمول تھا۔ وہ اپنی عمر کے آخری ایام بلکہ آخری دم تک علم وادب سے جڑے رہے۔ اپنی معذوری کے باوجود جی سی یونیورسٹی میں پروفیسر آف ایمریطس کے طور پر ہفتے میں دو بار لیکچر دینے کے لیے جاتے رہے۔ طویل علالت اور معذوری کے باوجود حافظہ اور یادداشت میں فرق نہ آیا۔ آواز کی گھن گرج آخر تک قائم رہی۔ برسوں قبل ملنے والے شخص کو پہچان لیتے اور ماضی بعید کے واقعات ان کے حافظے میں ہو بہو محفوظ تھے جنھیں وہ پوری جزئیات سمیت پوری تفصیل سے بیان کر سکتے تھے اور کسی بھی موضوع پر ایک ہی سانس میں درجنوں کتابوں کے نام گنوا دیتے۔ کون سی کتاب مخطوطہ، رسالہ، اخبار کس شخص سے اور کہاں سے ملے گا! یہ سب کچھ اب بھی ان کی انگلیوں پر تھا۔ چوراسی سال کی عمر پانے اور علیل ہونے کے باوجود زندگی اور زندگی کی دلچسپیوں سے وابستگی نہایت گہری تھی۔ دمے (Asthma) کا شدید دورہ ہے، سانس اکھڑا ہوا ہے، تیماردار اور گھر والے سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب چند دن کے مہمان ہیں مگر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ مستقبل کے علمی و تحقیقی منصوبے سوچ رہے ہیں۔ اکیڈمی کے ملازمین کو کام بتا رہے ہیں۔ ان کی سستی پر انھیں ڈانٹ ڈپٹ رہے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے آئے ہوئے مسودات دیکھ رہے ہیں۔ طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو ہسپتال لے جائے جاتے، چند دن خاموشی رہتی، خون لگتا۔ میں سمجھتا کہ ڈاکٹر صاحب اب کے جاں بر نہیں ہوں گے مگر جب ان کے وجود میں زندگی کی ہلکی سی لہر دوڑتی تو ڈاکٹر صاحب پھر چل سو چل۔

الغرض ادب و تحقیق کا یہ جن آخری دم تک اپنی علمی طاقت کا مظاہرہ کرتا رہا۔ پھر ایک دن اچانک ایک دوست نے فون پر اطلاع دی کہ ڈاکٹر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ زندگی بھر کسی سے ہار نہ ماننے والا یہ جن موت کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گیا مگر وحید قریشی ہار ماننے والا نہیں۔ وہ اپنی زندگی اور طاقت کا اظہار سدا اپنی تحریروں کے ذریعے کرتا رہے گا۔ اس نے اردو زبان وادب اور اس سے تعلق رکھنے والے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں پر جو نقوش ثبت کیے ہیں انھیں کبھی مٹایا نہ جا سکے گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی ۔۔میرے استاد

قاسم محمود احمد

جہانِ علم و ادب میں اگر کوئی شخص ڈاکٹر وحید قریشی کے نام سے واقف نہیں تو یہ اس شخص کی کم علمی ہے۔ وہ تحقیق و تنقید اور شعر و ادب کی دنیا میں نابغۂ روزگار تھے۔

۲۰۰۰ء کے موسم سرما کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ سرما کی آمد آمد تھی۔ لاہور شہر اور قرب و جوار کے علاوہ پنجاب کے بعض دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے تشنگانِ علم اورینٹل کالج میں سال اول کے کمرہ جماعت میں جمع ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں ایم اے اردو کی کلاس شیرانی ہال سے ملحق جنوب مغربی کمرے میں ہوتی تھی جہاں آج کل کتب خانہ واقع ہے۔

پہلے دن پہلی کلاس ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے پڑھائی۔ انھوں نے اسالیب نثر کا پرچہ شروع کیا۔ دوسرے گھنٹے میں ڈاکٹر فخر الحق نوری صاحب نے غزلیات غالب کی تدریس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وقفہ تفریح اور پھر پتا چلا کہ اب ڈاکٹر وحید قریشی کلاس لیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایک نوجوان استاد ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب بھی آئے۔ انھوں نے کہا: ''یہ ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ آج ان سے پڑھ لو، ان کو دیکھ لو، کل فخر کرو گے۔'' مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے ان سے پڑھا، ان کو دیکھا اور تادم آخر ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔

ڈاکٹر صاحب نے پڑھانا شروع کیا...... دکنی دور کی تاریخ ادب کی تدریس ان کے ذمے تھی...... ڈاکٹر صاحب کی عمر کوئی ۷۵، ۷۶ برس ہوگی۔ ان کی آواز بہت پاٹ دار تھی۔ ان کا انداز تدریس، گویا ایسے لگتا تھا جیسے ہم اسی دور میں پہنچ گئے ہیں جس دور کے شاعروں اور ادیبوں کا وہ ذکر کر رہے تھے۔ انھیں موضوع پر پوری گرفت حاصل تھی۔ مطالعہ خوب تھا۔ بیان مختصر اور جامع۔ لگتا تھا وہ پڑھا نہیں رہے موتی رول رہے ہیں۔ وقت گزرتا گیا اور ہم مستفیض و مستفید ہوتے رہے۔ چند ماہ گزرے تو رمضان کا مبارک مہینا آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو میں نے افطار کی دعوت دی۔ میں ان دنوں یونی ورسٹی کے ہاسٹل خالد بن ولید ہال کے کمرہ نمبر ۵۰ میں مقیم تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: اچھا! میں ضرور آؤں گا۔ ''اچھا'' میں الف کی قدرے طوالت سے مجھے لگا کہ وہ بادل نخواستہ دعوت قبول کرنے کی ہامی بھر رہے ہیں۔ پھر ساتھ ہی فرمایا: چلو کل آؤں گا۔ جی منظور!

اگلے دن شام کو افطار میں کوئی ۲۰ منٹ باقی تھے ڈاکٹر صاحب کی گاڑی (سفید رنگ کی سوزوکی مہران) مع ڈرائیور خالد بن ولید ہال میں رکی۔ ہم چند طالب علم ان کے استقبال کو موجود تھے، جن میں اورنگ زیب نیازی، مظہر دانش، اسد مصطفیٰ، امجد علی انجم اور راقم شامل تھے۔ ڈاکٹر صاحب جب ہاسٹل کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو فرمایا: کبھی میں اس طرح کی سیڑھیاں بھاگ کر چڑھا کرتا تھا مگر اب...... بہرحال۔ وہ کمرا نمبر ۵۰ میں تشریف لائے۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی پھر روزہ افطار کیا اور ہمارے

ساتھ کھانا کھایا۔

اس وقت ڈاکٹر صاحب کی عمر ۷۶ برس کی تھی اور بہت سے عوارض بھی ساتھ لگے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے روزہ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ''کل میں نے روزہ نہیں رکھا ہوا تھا۔ اس لیے آنے میں متامل تھا۔ لیکن آج میں آپ کی افطاری کی خاطر روزہ رکھ کر آیا ہوں۔'' میں نے عرض کیا: سر! روزہ تو اللہ کی خاطر رکھا جاتا ہے نہ کہ افطاری کے لیے۔ ڈاکٹر صاحب بہت شگفتہ مزاج تھے۔ میری بات سن کر انھوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، پھر فرمایا: اللہ تو میری بیماری اور بڑھاپے کے پیش نظر معاف کر ہی دیتا مگر تم نے نہیں کرنا تھا۔ میں ان کی صاف گوئی، سچائی اور بے باکی پر حیران ہوا اور داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

۲۰۰۱ء میں وہ گھر کے اندر فرش پر پھسل کر گر پڑے۔ ان کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا۔ مظہر دانش اور میں ان کے پاس جاتے۔ ان سے باتیں کرتے اور ان کے پاؤں دابتے۔ ان کو اٹھ بیٹھنے میں مدد دیتے۔ انھیں ورزش کرواتے۔ وہ ہمیں اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ اسی اثنا میں دانش صاحب جاپان چلے گئے۔ میں تنہا ان کے پاس جاتا رہا۔ اور پھر اورنگ زیب نیازی اور میں جانے لگے۔ ڈاکٹر صاحب پہلے سمن آباد میں رہتے تھے۔ جب ای ایم ای والے مکان میں منتقل ہوئے تو انھوں نے اپنا کتب خانہ ڈاکٹر طارق عزیز کے ہاں رکھوا دیا۔ اس کے بعد جب کتب خانہ ای ایم ای میں گیا تو ابھی تک کتابیں ڈبوں میں بند تھیں۔ نیازی صاحب اور میں کئی دن تک کتابیں الماریوں میں رکھتے رہے۔ آخر کار وہ کتب خانہ گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور کو عطیہ کر دیا گیا۔ یونی ورسٹی نے انھیں پروفیسر آف امریطس مقرر کیا اور وہ تادم آخر اس اعزازی منصب پر فائز رہے۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بندہ جاتا ہے تو جائے لیکن جملہ نہ جائے۔ ان کی شگفتہ مزاجی اور خوش مذاقی کے حوالے سے چند واقعات کا ذکر مناسب ہوگا۔

ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے: ۱۹۷۷ء میں جب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ''صد سالہ تقریبات ولادت علامہ اقبال کمیٹی'' بنائی تو میں بھی اس کا رکن تھا اور فیض احمد فیض بھی تھے۔ ایک دن اس کمیٹی کا اجلاس تھا اور طے کرنا تھا کہ اقبال کے آبائی شہر سیالکوٹ میں اقبال کی کوئی یادگار بنائی جائے۔ کسی نے کہا لائبریری بنا دیں کسی نے کالج کا مشورہ دیا۔ فیض صاحب، کہنے لگے کہ اقبال کو ورزش کرنے کا شوق تھا لہٰذا وہاں ایک جمنازیم بنا دیا جائے۔ میں نے کہا نہیں اقبال کو بچپن میں کبوتر پالنے کا شوق تھا لہٰذا وہاں کبوتر خانہ بنایا جائے...... یہ واقعہ سنا کر ڈاکٹر صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

ایک دن ناصر کاظمی کا ذکر ہونے لگا۔ قریشی صاحب ان کی شاعری پر ایک پر مغز اور سیر حاصل تبصرہ کرنے کے بعد کہنے لگے: ایک دفعہ ناصر کاظمی مجھ سے ناراض ہو گیا۔

میں نے پوچھا: وہ کیوں؟ سر!

فرمایا: ''میں نے اس سے کہا کہ آپ کی شاعری پر ایک شعر ہو گیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو سناؤں۔ اس نے کہا سنا دو۔ ڈاکٹر صاحب نے جو شعر سنایا وہ تو راقم کو یاد نہیں رہا البتہ اس کا مفہوم یہ تھا کہ ہم میر کے شعر لے کر دائیں بائیں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے: شعر سن کر ناصر کاظمی مجھ سے ناراض ہو گیا۔

حفیظ جالندھری کا ذکر آیا تو کہنے لگے اس کا مشہور شعر ہے:

ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں اور توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

میں اس نے شعر پر گرہ لگائی (گرہ کا مصرع مجھے بھول گیا ہے) تو حفیظ مجھ سے ناراض ہو گیا، آ کر جب وہ بستر مرگ پر تھے اور ہسپتال میں داخل تھے تو مجھے پیغام بھیجا کہ کیا اب جنازے ہی پر آ ؤ گے؟ میں ہسپتال گیا تو ہم دونوں آب دیدہ ہو گئے۔ پھر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔''

ڈاکٹر وحید قریشی کئی سال تک اسلامیہ کالج گوجرانوالہ اور اسلامیہ کالج لاہور میں تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج آ گئے۔ انھوں نے اپنی تدریسی اور انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ کئی کمیٹیوں کے ممبر اور شعبہ اردو، اورینٹل کالج اور کلیہ علوم شرقیہ و اسلامیہ کے سربراہ رہے۔ علاوہ ازیں مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین، اقبال اکادمی پاکستان لاہور کے ناظم اور بزم اقبال لاہور کے چیئرمین رہے۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے چیئرمین اور مخزن کے مدیر تادم آخر رہے۔

جولائی ۲۰۰۵ء میں راقم کا تقرر بطور لیکچرار حافظ آباد میں ہو گیا تو ملاقاتوں کے سلسلے میں وقفے طویل ہو گئے۔ تاہم جب کبھی لاہور آتا تو اپنے استاد ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے ساتھ ان کے پاس جانے کا اتفاق ہوتا۔ آخری ملاقات ان سے امجد علی انجم (راقم کے ہم جماعت) کے ہمراہ ہوئی۔ اس دن میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کا عزم جوان اور حوصلہ بلند تھا۔ فرمایا: ''میں ذرا ٹھیک ہو جاؤں تو پھر فلاں منصوبے پر کام کرنا ہے۔ شاعری کے دو مجموعے تیار ہو گئے ہیں۔ ان کو مرتب کرنا ہے۔'' وہ ہمیں اپنے اشعار بھی سناتے رہے۔ امجد نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا: ''سر میں شعری مجموعے ترتیب دینے میں آپ کی مدد کروں گا۔'' انھوں نے فرمایا: ''ٹھیک ہے ذرا ٹھیک ہو جاؤں تو آ جانا۔''

ڈاکٹر صاحب کا حافظہ بہت قوی تھا۔ کالج میں زمانہ طالب علمی کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا: ''جب میں نے بی اے کر لیا تو والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں وکیل بنوں۔ میں گھر سے ایل ایل بی کے لیے فیس جمع کروانے آیا تھا مگر میں نے سوچا کہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولا جائے گا اور تھرڈ کلاس وکیل بن کر کیا کروں گا۔ کسی کچہری کے سامنے اشٹام فروشی یا وثیقہ نویسی۔ لہٰذا میں نے ایم اے فارسی میں داخلہ لے لیا۔ جب گھر والوں کو معلوم ہوا تو ڈانٹ پڑی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ مظفر علی سید، ڈاکٹر عبدالسلام اور حنیف رامے میرے ہاسٹل فیلو تھے مگر حنیف رامے جب وزیر اعلیٰ بنا تو کئی سال تک میری پروفیسر شپ کی راہ میں حائل رہا۔ آخرکار یہ رکاوٹ ختم ہو گئی اور میں پروفیسر بن گیا۔''

ڈاکٹر طاہر القادری پنجاب یونی ورسٹی میں اسلامیات کے استاد رہے اور خالد بن ولید ہال کے سپرنٹنڈنٹ بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ ان پر کوئی کیس بن گیا تھا اور میں اس کیس میں انکوائری آفیسر مقرر ہوا تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی استاذ الاساتذہ تھے ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی جیسے اساتذہ کے نام آتے ہیں۔

۱۷ اکتوبر ۲۰۰۹ء مغرب کے بعد میں سائنگلہ ہل میں تھا کہ میرے ہم جماعت اسد مصطفیٰ کا ٹیلی فون آیا: کیا آپ کو پتا چل گیا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی اب دنیا میں نہیں رہے؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مجھے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان کے عزم و ارادے، ان کا حوصلہ، ان کی ہمت۔ وہ آٹھ سال تک طرح طرح کی بیماریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے تھے۔ تصدیق کے لیے استاد محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو فون کیا۔ ان کی مدھم مدھم اور رقت آمیز آواز ہی سے میں سمجھ گیا کہ خبر غلط نہ تھی۔ اگلے دن اتوار تھا اور میں صبح سویرے جنازے میں شمولیت کے لیے نکلا، ہاسٹل پہنچا۔ وہاں سے اپنے دوستوں شبیر احمد رندھاوا اور سلیم سہیل کے ساتھ ای ایم ای سوسائٹی پہنچا۔ نماز جنازہ میں شامل ہوا اور دعائے مغفرت کی۔ واپسی پر ہم اپنے استاد ڈاکٹر فخر الحق نوری صاحب کے ساتھ ان کی گاڑی میں ہاسٹل تک آئے۔ نوری صاحب نے بتایا کہ وحید قریشی صاحب کی نگرانی میں سب سے پہلا مقالہ خواجہ محمد زکریا صاحب نے لکھا اور سب سے آخری میں نے...... اس کے بعد وہ یونی ورسٹی سے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد چلے گئے تھے۔

اردو ادب کا ارتقا۔ ایک مختصر تجزیہ

ڈاکٹر تحسین فراقی

اپنے ابتدائی دکنی دور سے لے کر، بلکہ اس کے متوازی پنجابی عہد سے لے کر اب تک اردو ادب نے کئی کروٹیں لی ہیں اور ہر کروٹ نے اس ادب کو پہلے سے زیادہ متنوع اور ثروت مند بنایا ہے۔ ابتدائی زمانے کے انوکھے اور کسی قدر ناتراش خدوخال سے لے کر بیسویں صدی کے اواخر کے پرکشش حُسن و جمال تک، اردو کے اس بت ہزار شیوہ کے عشوہ وادا کے روپ متعدد تذکرہ نویسوں اور ادب کے تاریخ نگاروں نے گنوائے ہیں۔ یہ روپ تفصیل کا رنگ ڈھنگ بھی لیے ہوئے ہیں اور اجمال کا ذائقہ بھی۔ اس میں رنگ رنگ کے لسانی و تہذیبی خصائص کا تذکرہ بھی ہے، ہند اسلامی ثقافت کی بُو باس بھی ہے اور مغربی اثرات کے مسالوں کی خوشبو بھی ہے۔ لکھنے والے کا اپنا انداز و اسلوب اور اس کے مخصوص زاویۂ نگاہ نے اس طرح کی تاریخوں اور تحریروں کو ایک رنگ خاص عطا کیا ہے۔

اردو ادب کی مختصر تاریخیں لکھی گئیں اور محاکمے کیے گئے ہیں مگر یہ وہ زلفِ یار ہے جس کے خم و پیچ کے جمال کو اپنے اپنے رنگ ڈھنگ میں صدیوں تک بیان کیا جاتا رہے گا کیوں کہ حکایت لذیذ ہے اور دراز تر کہنے کا جواز رکھتی ہے۔ اس حکایت لذیذ کے بیان کرنے والوں میں ایک اہم نام مرحوم ڈاکٹر وحید قریشی (م ۱۷/ اکتوبر ۲۰۰۹ء) کا بھی ہے، جن کا نام اور کام تعارف کے تکلف سے بری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر کتاب ''اردو ادب کا ارتقا..... ایک جائزہ'' بقامت کہتر بقیمت بہتر کی مثال کہی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سو صفحے کی اس مختصر کتاب میں اردو ادب کے متنوع خدوخال کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اردو ادب کے ارتقا کے باب میں وہ شیرانی کے دبستان کا موقف اختیار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس کی ابتدا موجودہ پاکستان میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پنجاب کی ابتدائی لسانی خصوصیات سے اعتنا کرنے کے بعد عہدِ سلاطین اور خصوصاً محمد بن تغلق کا ذکر کیا ہے، جس کے دیوگیری کو دارالحکومت بنانے کے نتیجے میں اردو ادب کا ایک نیا لسانی کینڈا تیار ہوا، پھر انھوں نے علاءالدین بہمنی کے اعلان خودمختاری کے نتیجے میں ایک نئے اور مرکز سے آزاد عہد کے ظہور اور اس کے لسانی اور سماجی اثرات سے اجمالاً بحث کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے عہدِ زوال میں جنوبی ایران سے آنے والے تجار اور فوجیوں کے باعث دکنی پر فارسی کے اثرات نمایاں ہونے لگے اور فارسی شعرا کے اسالیب کا تتبع شروع ہوا۔ وجہی کی ''سب رس'' اس کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ دکنی شعرا وسطِ

ایشیائی اور ایرانی ثقافت میں سانس لینے لگے۔ دکن کے آخری دور میں دیگر اصناف کے مقابلے میں غزل کا ظہور ہوا، اور زور شور سے ہوا۔ فارسی کی روایت ولی کے دور تک دکن میں رائج ہو چکی تھی۔ ولی نے اس میں تغزل کے عنصر کا اضافہ کیا۔ ان فارسی اثرات کے نتیجے میں اردو شاعری نے صدیوں کا سفر برسوں میں طے کیا۔ اس میں وہ رچاؤ اور پختگی آنے لگی جو فارسی شاعری کا مابہ الامتیاز تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان اثرات کے باب میں ''متبدل بندی'' کی روایت کا ذکر بھی کیا ہے اور متعدد شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ اس روش کی مدد سے فارسی اشعار کا اردو میں ترجمہ ہوا اور یہ اثر غالب کے عہد تک برابر قائم رہا۔

اہل علم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اردو کی تمام شعری اصناف میں غزل کو مرکزیت حاصل ہے، چناں چہ اردو غزل کے مزاج اور اس کے ناک نقشے کے صحیح ادراک کے لیے بعض علائم اور مناسبات کا شعور حاصل کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مناسبات حسن، مناسبات عشق، مناسبات فقر، مناسبات امارت، مناسبات باغ و بہار، مناسبات برشگال اور مناسبات علم[1] وغیرہ کی بہت عمدہ تفصیلات مہیا کی ہیں۔ ان مناسبات کے ذکر سے یہ مختصر جائزہ خاصا وقیع ہو گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ غزل کے لہجے میں تصوف کا رنگ کس کس طرح کی اصطلاحات کے ذریعے آتا ہے اور عاشقانہ، رندانہ اور خارجی متعلقات حسن سے مربوط الفاظ اپنے باطن میں کیا کیا عارفانہ اور صوفیانہ معانی رکھتے ہیں، ان کی خوبی سے وضاحت ان اوراق میں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا موقف ہے کہ دکنی شاعری میں ''مکان'' کی اہمیت کا احساس بہت جاندار ہے۔

اس مختصر کتاب کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب نے دکنی اور پنجابی ادب کی مماثلت کا دلچسپ احوال اجمالاً لکھا ہے۔ ان کے خیال میں ضیاء الدین برنی اور سراج عفیف کی تاریخوں سے فوج کے بعض عہدہ داروں کے پنجابی اور ملتانی ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔ دکن میں ایرانیوں کے بعد پنجابیوں کو ایک خاص ثقافتی مرتبہ مل چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ پنجابی اور اردو کی صرف و نحو میں بائیس قاعدے مشترک ہیں۔ اہم تر بات یہ ہے کہ نہ صرف دکنی زبان بلکہ دہلی کے آس پاس کی اردو بھی پنجابی اثرات سے بچ نہیں سکی۔ قریشی صاحب کا یہ موقف بالکل درست معلوم ہوتا ہے اور اس کے متعدد شواہد نہ صرف اٹھارھویں، انیسویں صدی کی شاعری میں بلکہ نثر میں بھی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تو مثالیں درج نہیں کیں مگر میرے مطالعے میں اس ضمن میں جو متعدد نظائر سامنے آئے، ان میں سے چند ایک کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ میر حسن اور مصحفی کے یہ شعر دیکھیے اور خط کشیدہ لفظوں پر نگاہ رکھیے، جو خالصۃً پنجابی ہیں:

(ا) جگر میں اگر آہ کی سُول ہو — لگے خار، کیسا ہی گو پھول ہو
اچانک گئی آنکھ اتنے میں کھل — بھرے اشک رخسار پر آئے ڈھل

(میر حسن)

(ب) نہ میں صحرا میں، نہ گلشن میں نکل جاؤں گا — خوگر شہر ہوں یاں خاک میں رل جاؤں گا

(میر حسن)

''توبۃ النصوح'' میں ڈپٹی نذیر احمد نے کیم شحیم جوان کو'' ڈھو جوان'' لکھا ہے۔ ڈھو بالکل پنجابی ہے۔ نہیں بھولنا چاہیے کہ نذیر احمد، پنجاب کے قصبے کنجاہ میں رہے ہیں۔

علاوہ ازیں چناں ان پڑھ، مخلونا، لون مرچ اور متعدد الفاظ علائم تراکیب اصلاً پنجابی ہیں اور لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک وسیع میدان تحقیق، ان جیسے متعدد شواہد کی موجودگی میں ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ کہنا اپنے اندر بڑی صداقت رکھتا ہے کہ

''لکھنو، الہ آباد، حیدرآباد دکن، بمبئی اور دوسرے ادبی مراکز میں جو لہر پوری شادابی سے جاری ہوئی، اس کا اصل منبع پنجاب ہی تھا۔''

زیر نظر کتاب میں اجمالاً ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اردو ادب کے ہر قابل ذکر عہد کا جائزہ لیا ہے اور اس عہد کی لسانی خصوصیات کا بھی اشارۃً تذکرہ کیا ہے مگر حیرت ہے کہ انھوں نے میر و سودا کے دور کو، جو ایک اعتبار سے اردو ادب کا زریں ترین دور کہلاتا ہے، نہایت درجہ اجمال سے نپٹا دیا ہے۔ انھوں نے اس عہد کے ان لسانی مباحث کو سرے سے نظرانداز کر دیا ہے، جس کے دو اہم کردار آرزو اور حزیں لاہجی تھے۔ حد یہ ہے کہ سودا کے ہاتھوں مکیں کی خبر گیری اور ''عبرۃ الغافلین'' کا ظہور، یہ سب امور کم از کم ایک پیرے کے مستحق تو تھے ہی۔ ان امور کا ذکر اس لیے بھی ضروری تھا کہ اردو کے ابتدائی تنقیدی سرمایے پر مذکورہ لسانی مباحث کے نہایت گہرے اثرات ہیں جنھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی اس مختصر کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے باب دہم سے دوازدہم تک میں پنجاب میں پیدا ہونے والے اردو ادب سے بحث کر کے اس کے خصائص و مختصات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ ادب اپنے مزاج اور محاورے میں دہلی اور لکھنو کے ادب سے کس طرح مختلف اور منفرد تھا، اس کی بخوبی نشان دہی کی گئی ہے۔

ہمارے ادبی مورخوں نے عام طور پر سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں ہونے والے اردو ادب کے ارتقا کو نظرانداز کیا ہے۔ زیر نظر کتاب ان مراکز پر توجہ دے کر اس صورت حال کی ایک گونہ تلافی کرتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شعر و ادب کے ارتقا کو ایک خاص علاقے تک محدود کرنے اور اس پر اصرار کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ اس سے کسی خاص مرکز سے سند گیری کے میلان کی بھی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے جو خود دہلی کا سپوت تھا مگر جس کی نگاہ ایران و توران اور پنجاب کے سرمۂ فیض سے بھی تمتع اندوز تھی، کم و بیش ایک سو پندرہ برس پہلے، کس قدر پتے کی بات کی تھی:

''کوئی شہر ایسا نہیں رہا، جس کے لوگوں کی زبان عموماً سند کے قابل ہو...... اب جیسے اور شہر، ویسے ہی لکھنو، جیسے چھاونیوں کے بازار، ویسی ہی دلی بلکہ اس سے بھی بدتر۔'' (آب حیات ص ۶۳ نسخۂ لاہور، ۱۹۰۷ء)

ڈاکٹر صاحب نے اردو ادب کے ارتقا کے ضمن میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہمہ گیر تبدیلیوں کا بھی ذکر کیا ہے مگر ان کا یہ کہنا کہ اب مردہ ادب کی جگہ زندہ ادب آیا، ایک طرح کا مبالغہ آمیز اور جارونی بیان ہے، جس کی توقع قریشی صاحب جیسے محتاط محقق اور نقاد سے نہیں کی جا سکتی۔ ہاں! ان کا یہ کہنا درست ہے کہ سرسید تحریک کے سب سے زیادہ اثرات پنجاب پر ہوئے لیکن اس کے ساتھ، بلکہ اس سے کچھ پہلے پنجاب کی ادبی فضا پر داغ کے اثرات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا اور قریشی صاحب نے اس امر کو بھی قابل توجہ جانا ہے۔

۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۰ء تک پنجاب کو دلی اور لکھنؤ جیسی مرکزیت حاصل ہوئی اور اس کی سرزمین سے اقبال جیسی شخصیت کا ظہور ہوا۔[۲]

زیرِ نظر کتاب میں ترقی پسند تحریک، جدید ادب، اردو ادب میں ۱۹۶۰ء کے بعد کے تجربات، علامتیت اور موجودیت کے اردو ادب پر اثرات سے بھی اعتنا کیا گیا ہے، گو کہ نہایت درجہ اجمالی طور پر۔ یہ کتاب پاکستان کے اردو ادب کے اہم خدوخال کا اشاریہ فراہم کرتی ہے اور اس کا رشتہ ملک کی تہذیبی، سیاسی، معاشی اور عمرانی صورت حالات سے جوڑ کر ایک مربوط منظرنامہ مہیا کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ ایک سو صفحات پر مشتمل یہ چھوٹی سی کتاب اپنی بعض کمیوں کے باوجود (مثلاً تخلیق پاکستان کے بعد پاکستانی اور اسلامی ادب کے مباحث وغیرہ کے نہ ہونے کے باعث) اپنے اندر اجمالاً اردو ادب کی کئی صدیوں کا سامان سمیٹے ہوئے ہے اور اپنے بعض امتیازات کے باعث، جن کا پیچھے ذکر ہو چکا، ایک قابلِ توجہ کتاب ٹھہرتی ہے۔

حواشی

۱۔ مثال کے طور پر مناسبات علم کی فہرست دیکھیے: کتاب، ورق، صفحہ، شیرازہ، نوشت و خواند، قلم، کلک، لوح، کاغذ، نسخہ، جلد، ادب، اخلاق، منطق، حکمت، ریاض، معقول منقول، اسرار، رموز، اصلاح، صرف، نحو، تارح، مناظر، تختہ، جزو، سیر، قصص، تفسیر، حدیث، کلام، مناظرہ، قواعد، مبادی، مقدمہ، تذکرہ، اصول، فقہ، فرائض، نظم، نثر، عروض نامہ، ردیف، معانی بیان وغیرہ۔

۲۔ اقبال کے ہمہ گیر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم قریشی صاحب نے کسی قدر درست لکھا ہے کہ ۱۹۰۰ء سے لے کر کم و بیش ۱۹۳۰ء تک یہ ربع صدی دراصل اقبال صدی ہے اور اس نے برصغیر کے تمام علاقوں میں بسنے والے ادبا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور آنے والے ترقی پسند شعرا و ادبا اور نقاد جو اقبال کو عام طور پر رجعت پسند کہتے تھے۔ اپنی شاعری اور اپنے افکار کو اقبال کے رنگ سے نہ بچا سکے۔'' ص ۸۵

ڈاکٹر وحید قریشی کا مختصر سمعی و بصری آخری انٹرویو

تاریخ انٹرویو: ۱۴ مارچ ۲۰۰۹ء　　　　انٹرویو: محمد سلمان بھٹی

یہ انٹرویو میں نے ڈاکٹر وحید قریشی سے اپنے مقالے کے سلسلے میں لیا تھا۔ کیوں کہ فاضل استاد میرے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے نگران بھی تھے، اس لیے ان سے گاہے بگاہے ملاقات رہتی تھی۔ بظاہر تو ڈاکٹر صاحب تھیٹر کے آدمی نہیں تھے لیکن اپنی ذات میں ایک عہد تھے، اسی لیے میں نے ان سے اپنے مقالے کے سلسلے میں انٹرویو لیا۔ یوں تو جب بھی ان سے ملاقات ہوتی تو تھیٹر کی کوئی نہ کوئی نئی بات نکل ہی آتی، لیکن میں ان کی یادداشتوں کو باضابطہ طور پر محفوظ کرنے کے سلسلے میں سوائے ایک کوشش کے علاوہ مزید کوئی کوشش نہ کر سکا۔ اسے میری سستی کہہ لیں، تشنگان علم و ادب کے لیے بدقسمتی یا پھر کسی اور خطاب پر محمول کر دیں۔ قصہ مختصر ڈاکٹر صاحب سے بے تکلفی بھی تھی، اسی لیے انھوں نے اس انٹرویو میں پنجابی زبان کا استعمال کیا۔ میں نے انٹرویو کی اشاعت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اردو میں تحریر کر دیا ہے۔ یہ یاد رہے کہ ضعف اور شدید علالت کی وجہ سے دوران گفتگو بھی کبھی کبھار ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں ربط نہیں رہتا تھا۔ اسی وجہ سے انٹرویو کی نوک پلک خود سے ترتیب دی ہے تاکہ ربط اور انٹرویو کی اصل برقرار رہے اور قارئین کے سامنے لاہور تھیٹر کے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی کی کچھ یادداشتیں پہنچ سکیں۔ یہ رائے حتمی تو نہیں لیکن میرے خیال میں یہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا محفوظ کیا گیا آخری ویڈیو (سمعی و بصری) انٹرویو تھا۔ میں نے اس انٹرویو کی سترہ منٹ کی ریکارڈنگ کو صفحۂ قرطاس پر پھیلا دیا ہے۔ اتنی بڑی شخصیت سے انٹرویو کے لیے سترہ منٹ بہت کم تھے۔ لیکن اس انٹرویو کے مختصر ہونے کی وجہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی شدید علالت اور ضعف تھا، کیوں کہ انٹرویو کے دوران سترہ منٹ میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب بہت تھک گئے اور انھوں نے تھکن کا اظہار بھی کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس انٹرویو کو اتنا ہی ریکارڈ کر سکا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی مجھ پر انتہائی شفقت تھی کہ انتہائی علالت کے باوجود انھوں نے بہت شگفتگی اور حاضر جوابی سے میرے سوالات کا جواب دیا۔ اگر اس روز کچھ اور وقت مل جاتا تو شاید میں ان کی تھیٹر کے متعلق اور بہت سی قیمتی یادداشتیں محفوظ کر لیتا مگر۔۔ مگر یہ نہ ہو سکا.........

انٹرویو

سوال: آپ کے خیال میں لاہور تھیٹر میں تقسیم سے پہلے اور بعد میں کیا فرق ہے اور اگر ہے تو اس کا ہمارے تھیٹر پر کیا اثر پڑا؟

جواب: موضوع کے اعتبار سے کچھ کم لیکن تکنیک کے اعتبار سے زیادہ فرق پڑا۔ پارٹیشن کے بعد تھیٹریکل ایلیمنٹ پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ تقسیم کے بعد طنز و مزاح کی طرف زور بڑھا۔ سیاسی اور ذو معانی فقروں کے استعمال کا رواج تقسیم سے پہلے نہیں تھا لیکن اب ہے۔

سوال: تقسیم سے پہلے آپ نے لاہور کی کس کس جگہ پر تھیٹر دیکھا؟

جواب: میں نے لاہور میں تھیٹر سینما ہالوں میں دیکھا۔ زیادہ تر تھیٹریکل کمپنیاں بھاٹی دروازے کے باہر آتیں اور کھیل کرتیں۔ سینماؤں میں ریگل، پلازا اور کراؤن تھے۔ ان سینما گھروں کے مالکان تھیٹر کے لیے تھیٹر کمپنیوں کو سینما کرایے پر دیتے تھے، مستقل سٹیج کہیں نہیں تھی۔ اگر تھی تو باغ جناح تھا جہاں سوندھی نے سٹیج بنوائی تھی۔ وہی مستقل سٹیج تھی لیکن اسے صحیح طرح سے آباد نہیں کیا جا سکا۔

سوال: جو تھیٹر کمپنیاں تقسیم سے پہلے لاہور آتی تھیں، کیا وہ تقسیم کے بعد بھی آتی رہیں، اگر نہیں تو پھر یہاں تقسیم کے بعد کن کن لوگوں نے تھیٹر کیا؟

جواب: نہیں، ان کمپنیوں کا پاکستان آنا بند ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ یہاں آرٹ کونسل نے کام شروع کیا۔ الحمراء کا اڈا بنا اور یہاں فیض صاحب نے تھیٹر کے لیے بہت کام کیا۔ الحمراء میں جب فیض صاحب نے چارج سنبھالا تو انھوں نے کچھ کام کیا۔ ان سے پہلے اور بعد میں آنے والے لوگوں نے فیض جتنا کام نہیں کیا۔ جب پارٹیشن ہوئی تو لوگوں کو اپنی پڑی تھی، ہر شے اتھل پتھل تھی، کسی کو کسی کی ہوش نہ تھی۔ پھر ایک ری ایکشن بھی تھا کہ تھیٹر ہندو مذہب اور Dominence کے ساتھ جڑا تھا۔ اسی وجہ سے Neglect رہا، اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ پھر بعد میں توجہ ہوئی۔ ہاں صرف ایک روایت تھی اور وہ جی سی میں تھی لیکن وہ انگریزی کی تھی۔ ہمارا تھیٹر تقسیم سے چند سالوں بعد شروع ہوا۔

سوال: تھیٹر ہالوں کے متعلق آپ کیا کچھ جانتے ہیں؟

جواب: تھیٹر کے لیے کوئی باقاعدہ جگہ نہیں تھی۔ کمپنیاں کبھی کسی ہوٹل یا کسی میدان میں تھیٹر کر لیتی تھیں۔ باقاعدہ سٹیج بنا کر یہاں اسٹیج کرنے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ ہاں البتہ زیادہ تھیٹر دوسہرے کے سوانگ تھے۔ راون اور سیتا ہی کو زیادہ سٹیج کیا جاتا۔ مجھے یاد ہے ۱۹۳۰ء میں جب میں پہلی جماعت میں تھا، میں نے پہلا دوسہرا دیکھا۔ جس گاؤں میں چار ہندو امیر ہوتے وہاں وہ سٹیج بنواتے۔ رسیاں باندھ کر اور بانس کھڑے کر کے سٹیج تیار کرتے اور پھر زمین پر دری بچھا کر لوگوں کو بٹھا کر کھیل دکھاتے تھے۔

سوال: ڈراما نگار، ہدایت کار اور اداکار جن کے ساتھ آپ کا تعلق رہا ان کے متعلق تو بتائیں۔

جواب: ایک گویا تھا چشتی وہ ہیرو بنتا تھا اور اسی نے ڈراما بھی بنایا۔ اس میں اس نے ایک مسلمان فوج کے سالار کی حیثیت سے خود کو پیش کیا، یہ ۳۶۔۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ رفیع پیر کو بھی جانتا تھا، یہ بات ہے ۴۲۔۱۹۴۰ء کی۔ پھر گورنمنٹ کالج میں اے حمید صاحب بھی تھے Mathematics کے، وہ بھی کھیل کرواتے تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر صادق نے بھی کچھ کھیل سٹیج کیے، وہ کھیل ڈائریکٹ کرتے تھے۔ رفیع پیر اور صوفی تبسم بھی ہوتے تھے۔ رفیع پیر کو تلفظ کا بڑا وہم تھا، وہ لفظ کی غلطی برداشت نہیں کرتا تھا۔

سوال: ان میں سے کون سے بڑے فنکار ہمیں تقسیم کے بعد ملے؟

جواب: ان میں صفدر میر، تجمل، کچھ آئے کچھ چلے گئے۔ تقسیم سے پہلے پطرس نے بھی تھیٹر کے لیے کام کیا۔ امتیاز علی تاج نے اپنے ایک مضمون میں اس کا بڑی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

سوال: اے حمید کون تھے؟

جواب: یہ Mathematics کے استاد تھے جی سی میں۔ عبدالحمید نام تھا۔ ۴۲-۱۹۴۰ء میں جی سی میں ہی تھے۔

سوال: آج کے تھیٹر کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: میں اب تھیٹر نہیں دیکھتا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ صرف جگت بازی ہے۔

سوال: آپ نے تقسیم کے بعد لاہور میں جی سی کے علاوہ کس کس جگہ تھیٹر دیکھا؟

جواب: کراؤن، ریگل تھیٹر اور بھاٹی دروازے کے باہر۔

سوال: ان جگہوں پر تھیٹر اردو تھا یا کسی اور زبان میں بھی ہوتا تھا؟

جواب: اردو ہوتا تھا، انگریزی تو نہیں تھا، کبھی کبھی پنجابی میں بھی ہوتا تھا۔

سوال: پنجابی زبان بہت خوبصورت ہے، لیکن اسے تھیٹر میں سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: میرے نزدیک یہ ٹھیک نہیں۔ اسے ایک سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا ہے اور یہ بہت زیادتی ہے۔ یہاں اردو کے ساتھ بھی بہت برا ہوا۔ پنجابی کو جگت کے لیے استعمال کر کے اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی، اسے سنجیدگی کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ اردو اور پنجابی دونوں کے ساتھ زیادتی ہے۔

سوال: آپ پاکستان میں تھیٹر کے مستقبل کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: اب مجھے تھیٹر میں بہتری کی صورت حالات دکھائی نہیں دیتی، اسے کچھ لوگوں نے پھیلانے کے لیے کوشش کی ہے لیکن تفریح کے لیے۔ فائن آرٹ کے فروغ کے لیے۔

سوال: تھیٹر کے فروغ میں تعلیمی اداروں کا کیا کردار رہا ہے؟

جواب: تعلیمی اداروں کی جہاں تک بات ہے تو اس سلسلے میں لوگوں کا رویہ یہ ہے کہ ڈراما فحش اور غیر اسلامی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں بہت کم ڈرامے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی ڈرامے کی روایت فروغ نہیں پا سکی اور اس سوچ سے فائن آرٹ کے تمام شعبوں کو نقصان ہوا۔

سوال: تھیٹر میں ترقی کے کیا امکانات ہیں؟

جواب: اس کے لیے ایک بڑی اکیڈمی چاہیے۔ اس کے لیے اداکاروں اور ہدایت کاروں کے لیے ٹریننگ سسٹم ہونا چاہیے۔ اکیڈمیاں ہوں اور یہ علمی و ادبی لوگوں کے ہاتھ میں ہوں۔

سوال: کیا اچھے تھیٹر کا کمرشل ہونا ضروری ہے؟

جواب: کمرشل ہوئے بغیر تھیٹر آمدنی اور کشش کا ذریعہ نہیں بنتا۔ بہت کم لوگ ہیں جو صرف اس کی تکنیک کو انجوائے کرتے ہیں۔ لوگ تھیٹر میں تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ پھر Economic Appeal بہت اہم چیز ہے۔ اچھے تھیٹر کا کمرشل ہونا بہت ضروری ہے۔ ورنہ اچھے تھیٹر کے کمرشل نہ ہونے سے بھی اسے خود ہی نقصان پہنچ رہا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی: میرے محسن!

پروفیسر محمد حنیف شاہد

جناب افتخار عارف ڈاکٹر عبدالوحید قریشی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر وحید قریشی محقق ہیں، مترجم ہیں، اسکالر ہیں، شاعر ہیں، استاد ہیں اور ایسی ہمہ جہت شخصیت ہیں جن کی ساری زندگی جہان فکر و دانش کے در و بام تعمیر کرتے، سنوارتے، سجاتے گزری اور گزر رہی ہے۔''

اسی طرح برادر عزیز جناب ڈاکٹر گوہر نوشاہی جو ڈاکٹر وحید قریشی کے شاگرد رشید رہے ہیں، ڈاکٹر صاحب کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

''ڈاکٹر وحید قریشی ایک نامور محقق اور ممتاز دانش ور ہیں ان کی علمی و ادبی خدمات کی لاتعداد جہتیں ہیں جنھیں محدود اوراق کی تنگنائے میں سمونا آسان نہیں ہے۔''

مختصر یہ کہ ڈاکٹر وحید قریشی ہمہ جہت اور ہمہ پہلو شخصیت کے مالک ہیں، آپ معلم ہیں، مورخ ہیں، ماہر تعلیم ہیں، دانشور ہیں، شاعر ہیں، ادیب ہیں، محقق ہیں، نقاد ہیں اور کارکن تحریک پاکستان ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ ایک علمی و ادبی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی ولادت (جائے پیدائش) ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء کو میاں والی خاص میں ہوئی۔ آپ کا نام عبدالوحید، تخلص وحیدؔ اور قلمی نام اور پہچان ڈاکٹر وحید قریشی ہے۔ آپ کا آبائی شجرہ چھ واسطوں سے سلسلۂ قادریہ کے ممتاز صوفی اور صاحب ولایت بزرگ حضرت شاہ جمال نوری (م ۱۰۶۱ھ) سے ملتا ہے جو ستائیس واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے اور جہاں تک حضرت شاہ جمال نوری کا تعلق ہے آپ صرف ایک واسطے سے حضرت میاں میرؒ لاہوری کے مرید تھے۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے، ڈاکٹر وحید قریشی میانوالی میں (اپنے نانا مولوی احمد علی) کے گھر پیدا ہوئے اور کسووال کے پرائمری سکول میں ۱۹۳۰ء میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ آپ نے ۱۹۴۰ء میں امتحان میٹرک اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور ایک روایت کے مطابق اس سال اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے صرف تین طالب علموں کو گورنمنٹ کالج میں داخلہ ملا تھا اور ڈاکٹر وحید قریشی کے علاوہ بقول ڈاکٹر گوہر نوشاہی دوسرے دو طالب علم عنایت اللہ اور جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال تھے۔

آپ نے ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف۔ اے اور ۱۹۴۴ء میں بی۔ اے آنرز، ۱۹۴۶ء میں ایم۔ اے فارسی اور ۱۹۵۰ء میں ایم۔ اے تاریخ کے امتحانات پاس کیے جب کہ ۱۹۵۲ء میں فارسی میں پی ایچ ڈی (Ph.D.) اور ۱۹۶۲ء میں

اردو میں ڈی لٹ (.D.Litt) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ فارسی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی کو الفرڈ پٹیالہ ریسرچ سکالرشپ ملا اور ۱۹۵۰ء میں آپ نے فارسی کی ڈاکٹریٹ مکمل کی۔ اس ضمن میں آپ نے پروفیسر عباس شوستری سے چھ ماہ تک سبقاً سبقاً فارسی زبان پڑھی۔ پروفیسر عباس شوستری ایرانی تھے اور بہت عمدہ فارسی بولتے تھے۔ فارسی میں پی ایچ ڈی کے استاد و رہنما بھی وہی تھے۔ آپ نے "Insha Literature Persian - A Critical Study" کے موضوع پر فارسی میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی جب کہ ڈی۔ لٹ اردو میں آپ کے مقالے کا عنوان ''میر حسن اوران کا زمانہ'' تھا اور ۱۹۶۵ء میں آپ نے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

یہ حقیقت قابل توجہ اور قابل قدر ہے کہ اللہ رب العزت نے ڈاکٹر وحید قریشی کو عزت اور توقیر بخشی اور علوم سے بہرہ ور فرمایا جن کی انسان اس دنیاوی زندگی میں توقع کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو رب ذوالجلال نے ڈاکٹریٹ یعنی پی ایچ ڈی اور ڈی۔ لٹ دو ڈگریوں سے سرفراز فرمایا۔ یہ اعلیٰ اور ارفع تعلیم کا اعزاز تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو ملازمت ڈھونڈنے کی نوبت نہ آئی۔ آپ نے الفریڈ پٹیالہ ریسرچ سکالر کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک خدمات انجام دیں جب کہ تاریخ کے لیکچرر کی حیثیت سے اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں ۶ فروری ۱۹۵۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۵۶ء تعلیم و تعلم میں مصروف و مشغول رہے۔ بعد ازاں آپ گوجرانوالہ سے لاہور تشریف لے آئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں بطور لیکچرر شعبہ تاریخ ۲ جنوری ۱۹۵۷ء سے لے کر ۲۴ اگست ۱۹۵۸ء تک تعلیم دیتے رہے۔ ازاں اسی کالج یعنی اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں بطور لیکچرر و صدر شعبہ فارسی خدمات انجام دیں۔ آپ کی ملازمت کا یہ عرصہ ۲۵ اگست ۱۹۵۸ء تا ۲۰ دسمبر ۱۹۶۲ء تک محیط تھا۔ اس کے بعد آپ لیکچرار اردو کی حیثیت سے شعبہ اردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۱ دسمبر ۱۹۶۲ء سے لے کر ۲۰ دسمبر ۱۹۶۶ء تک مصروف کار رہے۔ علاوہ ازیں آپ بطور ریڈر (ایسوسی ایٹ پروفیسر) قابل قدر اور قابل عزت تعلیمی ادارے سے ۲۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تا ۲۴ اپریل ۱۹۷۵ء منسلک رہے، نیز آپ نے بطور غالب پروفیسر ۲۵ اپریل ۱۹۷۵ء سے لے کر ۱۳ فروری ۱۹۸۵ء تک خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ آپ نے بطور ڈائریکٹر اور سیکرٹری ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان لاہور، سیکرٹری دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری ایسوسی ایٹ پروفیسر، سابق ریڈر کے مساوی ۲ دسمبر ۱۹۶۳ء تا ۲ ستمبر ۱۹۶۴ء اور ناظم اقبال اکادمی پاکستان لاہور (اضافی فرائض) ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء انجام دیے۔ نیز بطور صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور آپ نے مختلف اوقات میں ۹ سال خدمات انجام دیں۔ علاوہ بریں آپ نے قریباً تین برس ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۷۳ء تک بطور انچارج شعبہ پنجابی پنجاب یونیورسٹی فرائض انجام دیے اور پھر ڈین رصدر شعبہ علوم شرقیہ و اسلامیہ ۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء سے لے کر یکم فروری ۱۹۸۱ء؛ صدر نشیں، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۷ء، معتمد اعزازی بزم اقبال لاہور ۱۹۸۷ء تا ۱۹۹۳ء، پروفیسر شعبہ ابلاغیات (حمید نظامی چیئر) پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۳ فروری ۱۹۹۱ء سے لے کر ۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء اور ناظم اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۹ ستمبر ۱۹۹۳ء تا ۱۲ جون ۱۹۹۷ء قابل قدر اور تاریخ ساز خدمات انجام دیں۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر وحید قریشی نے منصبی اور غیر منصبی، سرکاری اور نیم سرکاری خدمات انجام دیں جہاں آپ رکن، صدر رچیئرمین یا ناظم اور معتمد رہے۔ اس کے علاوہ بیس کے لگ بھگ اداروں کے آپ ممبر یا رکن رہے اور بیس کے قریب ملکی اور

بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی، یہی نہیں آپ نے مندرجہ ذیل رسائل و جرائد اور مجلات کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ یہ ایک ایسا وسیع، قابل قدر اور تاریخ ساز کام ہے جس کے ذکر کے بغیر صحافت کی تاریخ نامکمل رہے گی: سہ ماہی صحیفہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۳ء، جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۹۶۳)، اورینٹل کالج میگزین پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور (۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۲ء)، مجلہ مجلس تحقیق پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۲ء) سہ ماہی اقبال ریویو (اردو، انگریزی اور فارسی) اقبال اکادمی پاکستان لاہور (۱۹۸۲ء تا ۱۲ جون ۱۹۹۷ء) ماہوار اخبار اردو مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۸ء)، سہ ماہی مجلہ ''اقبال'' بزم اقبال لاہور (۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۵ء) ڈاکٹر وحید قریشی نے سات وقیع، عظیم الشان اور ممتاز اور تاریخی اہمیت کے حامل اداروں کے ترجمانوں کی یکے بعد دیگرے ادارت کے فرائض کماحقہٗ ادا کیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ Seven Stars, Seven Seas اور ''سبع سابل'' کے زمرے میں نہیں آتا تو شاید اس سے کم نہیں اور دنیائے صحافت میں شاید یہ اعزاز کسی مسلمان شخصیت کو حاصل نہیں ہوا۔ ایک بار ہم نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے ساتھ اپنے طویل اور بے تکلف روابط اور تعلقات کے پیش نظر انھیں "Intelectual Giant" کہا۔ انھوں نے قطعاً برا نہیں منایا بلکہ یہ فرمایا: ''یہ آپ کا حسن ظن ہے، میں تو اپنا فرض نبھانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اگر آپ کو میرا کام پسند آتا ہے تو اس کو اپنانے اور نبھانے کی سعی اور کوشش کیجیے اور سچ پوچھیے سر شیخ عبدالقادر پر میں نے اپنی تحقیق ۱۹۶۶ء میں شروع کی اور تادم تحریر جاری ہے، میں اس تحقیق و جستجو سے نہیں اکتایا۔ یہ ریسرچ ہنوز جاری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر میری اس تحقیق کے معترف تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس عظیم منصوبے ''کلیات نثر اردو'' (اردو و انگریزی) کو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام و انصرام شائع کرنے کا پروگرام بنایا اور باصرار اس ضمن میں ''ایگری منٹ'' (Agreement) پر ۲۷ اپریل ۲۰۰۷ء کو دستخط ثبت فرمائے اور میری کاپی بذریعہ رجسٹری میرے گھر کے پتے پر ارسال کیے جانے کے احکامات صادر فرمائے۔

چوں کہ ہمارے مشفق و مہربان اور قدر شناس اور قدر دان ہم سے جدا ہو کر اس دنیائے فانی سے منہ موڑ کر عالم جاودانی کو جا چکے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ وقت، حالات اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کے مستقبل کے ارباب بست و کشاد کے علم اور اس سلسلے میں کارروائی کی خاطر ''اقرار نامہ'' کی دستاویز محفوظ کی جائے۔ بنابریں ہم اسے اگلے صفحہ پر من و عن پیش کر رہے ہیں تاکہ سند رہے۔

ہم اس سلسلے میں مزید اس امر کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ ''اقرار نامہ'' پر کارروائی ہونے کے بعد جب ہم نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے درخواست کی کہ ہم نے ترتیب اور تدوین کا کام تو کر دیا ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے نصف معاوضہ پیشگی ادا فرما دیں اس پر ڈاکٹر صاحب نے از راہ لطف و عنایت فرمایا، جون ۲۰۰۷ء میں گرانٹ مل جائے گی، جولائی میں آپ کو ادائی کی جائے گی اور مزید تسلی کی خاطر یہ فرمایا: ''آپ کو معلوم ہے آپ کے معاملے میں میں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا، آپ اطمینان رکھیں۔''

قارئین کرام کے علم کے لیے ضروری ہے کہ اس منصوبے کا مختصراً تعارف کروایا جائے۔ یہ کام دو حصوں ''کلیات نثر اردو شیخ عبدالقادر'' اور "Collected Works of Sheikh Abdul Qadir (English)" پر مشتمل ہے۔ اور ہم نے ڈاکٹر

صاحب موصوف کی خدمت میں بارہ حصے (۶ حصے اردو اور ۶ حصے انگریزی) پیش کیے تھے جن کی کمپوز ہونے کے بعد بقول بابر پرویز صاحب انچارج پرل کمپوزنگ سنٹر تین بار پروف ریڈنگ ہو چکی ہے اور آخر میں میں دیکھ رہا ہوں۔" اقرار نامہ" حسب ذیل ہے:

اقرار نامہ

(برائے تالیف رترتیب رترجمہ وغیرہ)

اقرار نامہ ہذا بتاریخ ۱۲۷اپریل ۲۰۰۷ء مابین مغربی پاکستان اردو اکیڈمی (فریق اول) و محمد حنیف شاہد (فریق دوم) بسلسلہ کلیات نثر سر عبدالقادر قرار پایا کہ:

۱۔ کتاب مذکورہ کی طباعت مکمل ہونے پر اخراجات کا اندازہ کر کے فریق اول کتاب کی قیمت مقرر کرے گا جو کتاب کے سرورق پر درج ہو گی۔

۲۔ فریق اول کتاب کی تالیف، ترتیب، ترجمہ وغیرہ پر جو کام کرائے گا اس کا بالمقطع معاوضہ آٹھ ہزار روپے فی جلد ادا کرے گا۔

۳۔ کتاب کے جملہ حقوق بشمول مالکانہ حقوق بحق فریق اول محفوظ ہوں گے۔

۴۔ فریق اول کتاب کے جتنے ایڈیشن وقتاً فوقتاً شائع کرنا چاہے اس کا اسے حق حاصل ہوگا۔ اس پر کوئی مزید معاوضہ نہیں دیا جائے گا لیکن کسی ترمیم کی صورت میں فریق اول فریق دوم کو اس کا الگ معاوضہ دے گا۔

۵۔ اس کتاب کے دس اعزازی نسخے پہلے ایڈیشن کی اشاعت پر فریق دوم کو پیش کیے جائیں گے مزید نسخے وہ نصف قیمت پر خرید سکتا ہے۔

۶۔ مزید ایڈیشن پر فریق دوم کو پانچ نسخے اعزازی دیے جائیں گے اور مزید نسخے نصف قیمت پر خریدے جا سکتے ہیں۔

دستخط فریق اول	دستخط فریق دوم
سیکرٹری جنرل مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	محمد حنیف شاہد،
	۷۰اجہاں زیب بلاک، اقبال ٹاؤن لاہور
گواہ شد	گواہ شد:
محمد رفیق ولد محمد سلطان، ٹھٹھہ لنگیاں	پتا: ۲۵/۲۲ چمن آباد
ڈاکخانہ فیض پور خورد تحصیل فیروز والا ضلع شیخوپورہ	

یہ بات تو شاید سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ بڑے مشفق، مہربان، خلیق اور قدردان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کی حد تک (جو آپ کے ضمیر اور دل میں ہوتا) ذمہ دار اور راہنما تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ہماری ملاقات یا تعلق جہاں تک ہمیں یاد ہے ۱۹۶۳ء میں ہو گیا تھا۔ جب آپ پنجاب یونیورسٹی لائبریری تشریف لاتے تو دائرۂ معارف اسلامیہ اردو کے شعبے میں سید اولاد علی گیلانی، پروفیسر سید محمد امجد الطاف، پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع وغیرہم سے ملاقات کے لیے شعبہ مذکور میں ضرور تشریف لے جاتے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے ساتھ یہ تعلق اس طرح بڑھا اور استوار ہوا کہ انھوں نے میرے تحقیق کی طرف ذوق وشوق کو دیکھ کر میری توجہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے چھیاسٹھ سالہ قدیم ریکارڈ کو دیکھنے اور اس سے استفادہ کرنے کی طرف دلائی اور یہ واضح فرمایا کہ ہمارے دو بزرگ یعنی مولانا غلام رسول مہر اور سید نذیر نیازی ناکام ہو چکے ہیں۔ باوجود اس کے کہ انھیں میاں امیر الدین صدر انجمن نے ریسرچ اسسٹنٹ کی سہولت فراہم کی تھی۔ چھیاسٹھ اس لیے کہ اس عرصے میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (۹ نومبر ۱۸۷۷ء تا ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) اور سر شیخ عبدالقادر (۱۵ مارچ ۱۸۷۴ء تا ۹ فروری ۱۹۵۰ء) کی دو انتہائی قابل عزت واحترام اور قدآور شخصیات آتی تھیں اور ڈاکٹر وحید قریشی کو ان کے ساتھ قلبی اور روحانی لگاؤ اور پیار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے میاں امیر الدین سے اجازت لینے کی خاطر حکیم آفتاب احمد قرشی، ڈاکٹر جاوید اقبال، میاں ایم اسلم وغیرہم کی وساطت سے ان سے رابطہ قائم کیا تو پتا برادر محترم پیام شاہ جہان پوری کی معرفت پتا چلا کہ مولانا غلام رسول مہر اور سید نذیر نیازی نے کچھ عرصہ کے بعد اس عظیم کام پر تحقیق کرنے سے مجبوری کا اظہار کر کے معذرت کر دی تھی۔ مختصر یہ کہ ہم نے جب میاں امیر الدین سے اجازت حاصل کر کے ۱۸۸۴ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک کا ریکارڈ کھنگالا تو علامہ اقبال اور سر شیخ عبدالقادر کے حوالے سے انتہائی قابل قدر اور تاریخی نوعیت کا ریکارڈ دستیاب ہوا جہاں کسی ریسرچ سکالر کی رسائی نہیں ہو سکی تھی۔ القصہ علامہ اقبال اور تحریک پاکستان کے حوالے ہماری دو کتابیں بعنوان ''اقبالؒ اور انجمن حمایت اسلام'' اور ''تحریک پاکستان میں اسلامیہ کالج لاہور کا کردار'' زیور طبع سے آراستہ ہو کر قبولیت عام حاصل کر چکی ہیں، جب کہ سر شیخ عبدالقادر کے ضمن میں جو قیمتی ذخیرہ دستیاب ہوا تھا وہ کچھ تو اشاعت پذیر ہو چکا ہے اور باقی مذکورہ بالا حصوں کی زینت بنا ہے جو ان شاء اللہ شائع ہو کر ہدیہ قارئین ہوگا۔

چوں کہ مذکورہ بالا تحقیقی سرمایہ (جو علامہ اقبالؒ اور سر عبدالقادر سے متعلق تھا) ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی نظروں میں تھا۔ چناں چہ انھوں نے تجویز کیا کہ ہم ''سر شیخ عبدالقادر کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ لکھیں۔ مختصر یہ کہ ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں جس میں پروفیسر محمد علم الدین سالک اور ڈاکٹر وحید قریشی میرے ساتھ شامل تھے، ۱۹۷۳ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے کی منظوری ملی۔ پہلے پروفیسر محمد علم الدین سالک گائیڈ مقرر ہوئے، آپ جب اللہ کو پیارے ہو گئے تو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اور پھر آپ کے کہنے پر ہمارے محترم دوست ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا گائیڈ مقرر ہوئے، لیکن افسوس کہ ہماری یہ ساری محنت اکارت ہو گئی کیوں کہ ہمارے مقالے اور ہماری ریسرچ کو حاسدین کی نظر کھا گئی۔ اس حادثے کا ڈاکٹر صاحب کو دلی دکھ ہوا اور عرصہ بعد انھوں نے مجھ سے یہ فرمایا: ''شاہد صاحب! میں شیخ عبدالقادر کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔ آپ یہ سارا تحقیقی کام مرتب کر دیں، میں اسے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی طرف سے شائع کروں گا۔'' چناں چہ ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں ہم نے یہ کام مکمل کر کے آپ کے سپرد کر دیا تھا، قدرے باقی ہے، اللہ نے چاہا تو وہ بھی ہو جائے گا۔ اس پس منظر کے بعد ہم ان کتابوں کا سرسری جائزہ پیش کرنا چاہیں گے جو ڈاکٹر وحید قریشی کی ذاتی دلچسپی، راہنمائی، معاونت یا آپ کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوئیں:

''نذر اقبال'' پہلی کتاب ہے جو سر شیخ عبدالقادر کے علامہ اقبال کے بارے میں مضامین، مقالات، مقدمات اور مکاتیب کا مجموعہ ہے اسے ۱۹۷۲ء میں بزم اقبال لاہور نے شائع کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اگرچہ اس زمانے میں اس ادارے میں نہیں تھے لیکن آپ کی تحریک پر یہ کتاب بزم اقبال لاہور نے شائع کی۔ یہ سر شیخ عبدالقادر کے مضامین ومقالات کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۴۴

صفحات پر مشتمل ہے۔

''سر عبدالقادر اور اردو'' (منتخب مقالات) سر عبدالقادر کے اردو زبان و ادب پر مضامین کا مجموعہ ہے جو مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے مارچ ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔ اگر چہ یہ مجموعہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے زمانے میں شائع ہوا لیکن اس کی اشاعت کا سہرا ڈاکٹر وحید قریشی کے سر ہے جو ہم نے مرتب کر کے سعودی عرب (ریاض) سے انھیں ارسال فرمایا۔ یہ مجموعہ چھ اردو اور تین انگریزی مضامین مقالات پر مشتمل ہے اور اس کے مجموعی طور پر (۴۴+۳۲) ۷۶ صفحات ہیں۔

''آل انڈیا مسلم لیگ اور اردو'' یہ درحقیقت انگریزی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسوں میں پیش ہونے والی اردو کے حوالے سے قراردادوں اور تقاریر کا مجموعہ جو ہم نے مرتب کیا اور ریاض سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔ مقتدرہ قومی زبان کے ارباب بست و کشاد نے اعجاز احمد فاروقی صاحب سے اردو ترجمہ کروا کر اسے ۱۹۹۱ء میں شائع کر دیا لیکن انگریزی متن حذف کر دیا، جب کہ ہم نے تاکیداً لکھا تھا کہ انگریزی متن اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا جائے۔ ہم نے اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے رابطہ کیا اور یہ پیشکش کی کہ ہم ذاتی طور پر اردو ترجمہ کے ساتھ انگریزی متن شائع کروا کر آپ کی خدمت میں بھیج دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تجویز پسند فرمائی اور ہم نے اپنے قائم کردہ ادارے انٹرنیشنل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ریاض کی جانب سے مارچ ۱۹۹۲ء میں اردو + انگریزی میں لاہور سے چھپوا کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔ یہ مجموعہ (کتابچہ: اردو ۵۸ صفحات اور انگریزی ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اردو حصہ میں صفحہ پندرہ اور سولہ پر اردو میں اور انگریزی حصہ میں صفحہ سولہ پر قائداعظم محمد علی جناح کے انگریزی خط کے آخر میں ''اردو'' میں دستخط ثبت ہیں۔ یاد رہے کہ یہ خط انھوں نے نئی دہلی سے ۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو خواجہ حسن نظامی کے نام تحریر فرمایا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مجموعے میں اردو کی حمایت میں سر شیخ عبدالقادر کی تقاریر بھی شامل ہیں۔ نیز ڈاکٹر جمیل جالبی کا تحریر کردہ پیش لفظ، ڈاکٹر سلیم اختر کا تعارف اور امجد اسلام امجد کے تاثرات ہیں جب کہ ڈاکٹر وحید قریشی کا مندرجہ ذیل ''مقدمہ'' درج ہے:

مقدمہ

''آل انڈیا مسلم لیگ اور اردو'' کتابچے کی صورت میں پہلے اردو میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ مقصود یہ تھا کہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اسے بیک وقت شائع کیا جائے۔ اردو داں طبقہ تو ویسے بھی مسلم لیگ کی قراردادوں سے واقف ہے۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک مختلف اجلاسوں میں مسلم لیگ نے پے در پے ان قراردادوں کو منظور کیا اور بالآخر اسے تحریک پاکستان کا بنیادی حصہ قرار دیتے ہوئے جدوجہد آزادی کی شناخت بنایا۔ بنابریں قرارداد لاہور کے بعد یہ طے شدہ امر تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔ اور قائداعظم محمد علی جناح نے اس کا برملا اظہار اپنی ڈھاکے کی تقریر میں بھی کیا تھا۔ اس کے بعد ہر آئین میں اردو کو قومی زبان قرار دینے اور سرکاری اداروں میں رائج کرنے کا مسئلہ دساتیر کا حصہ رہا لیکن بوجوہ اسے بروئے عمل لانے کا معاملہ ملتوی کیا جاتا رہا، کیوں کہ یہ برسر اقتدار طبقے کے مفادات کے خلاف تھا لیکن رائے عامہ آج بھی مسلم لیگ کے فیصلے کی تائید کرتی ہے۔

محمد حنیف شاہد صاحب نے مسلم لیگ کی دستاویزات اور تقریروں کو یک جا کر دیا ہے جو انگریزی میڈیم کے خلاف اور اردو میڈیم کی حمایت میں ہیں، اس بنا پر نئی نسل کے لیے بھی یہ مسئلہ اس کے صحیح تناظر میں پیش کیا گیا ہے، کیوں کہ اس کے تاریخی پس منظر کے بغیر اردو کی اہمیت نئی نسل پر واضح کرنا ممکن نہیں۔ یہ نہایت اہم دستاویزات ہیں جنھیں ہر وقت قوم کے پیش نظر رہنا چاہیے۔ اس نادر پیشکش پر میں جناب محمد حنیف شاہد کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

۱۸ مارچ ۱۹۹۲ء ڈاکٹر وحید قریشی

ناظم

بزم اقبال و مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، چمن آباد لاہور

یہ بات قابل توجہ اور تاریخی نوعیت کی حامل ہے کہ مہاراجا دھیرج کمیش ورہ سنگھ بہادر دھر بھنگہ نے الہ آباد یونیورسٹی کو اس کی ''گولڈن جوبلی'' کے موقع پر ۱۹۳۷ء میں مہاراجا دھر بھنگہ انڈومنٹ لیکچر شپ کے نام سے ایک خطیر رقم عطا کی تھی جس کے تحت مختلف اوقات میں علم و فن کے ستاروں، علمی و ادبی شخصیات نے لیکچر دیے تھے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ لیکچرر کا انتخاب ایک کمیٹی کے ذمہ تھا جس کے تین ارکان تھے جن میں وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور مہاراجا دھر بھنگہ کا منتخب نمائندہ شامل تھے۔ چناں چہ مذکورہ بالا کمیٹی نے ڈاکٹر امرناتھ جھا کی درخواست پر لیکچر دینے کی دعوت قبول کر لی اور یکے بعد دیگرے اردو زبان و ادب، اردو شاعری، اردو ابلاغیات، اردو ڈراما، اردو مرثیہ اور فن تقریر پر آٹھ لیکچر دیے۔ سر شیخ عبدالقادر کے یہ لیکچر سننے کے لیے ایک کثیر تعداد میں شائقین اور اردو زبان و ادب کے پرستار آتے رہے جن میں پنڈت جواہر لعل نہرو اور سر تیج بہادر سپرو خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر کے لیکچروں کا یہ مجموعہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصہ میں اشاعت پذیر ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا وجود عمل میں آیا اور شاید یہی وجہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم کے وقت مہاجرین کے قافلوں کے سبب حالات پرسکون نہ رہ سکے اور کتاب زیر تبصرہ کا ایک بھی نسخہ سر عبدالقادر تک نہ پہنچ سکا۔ میں ذاتی طور پر سر شیخ عبدالقادر کے صاحبزادے شیخ منظور قادر کے دولت کدہ واقع لارنس روڈ لاہور پر کم و بیش تین سال تک جاتا رہا اور سر شیخ عبدالقادر اور شیخ منظور قادر کے عظیم کتب خانے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے ایک ایک نسخہ دیکھا لیکن "Urdu Language and Literature" کا ایک نسخہ بھی دستیاب نہیں ہوا۔ سعودی عرب میں اپنے طویل قیام کے دوران جب رخصت پر لاہور آتا تو ڈاکٹر وحید قریشی اس کتاب کی بابت ضرور پوچھتے اور تاکید کرتے کہ بار بار یاد دہانی کراؤ۔ یہ کام میرے لیے مشکل نہ تھا۔ میں اس کام کو دوسرے کاموں پر ترجیح دیتا رہا۔ بالآخر مجھے کامیابی کا مژدہ ملا اور مسٹر آر۔ ایس۔ سکسینہ نے خوشخبری سنائی کہ فوٹو کاپی، جلد اور ڈاک کے لیے پانچ سو روپے کا ڈرافٹ بھیج دو۔ میں نے فوراً تعمیل کی اور قریباً دو ہفتے کے بعد میری خوشی اور مسرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے ایک رجسٹرڈ پیکٹ مسٹر آر۔ ایس۔ سکسینہ بی۔ ایس سی، ایل ایل بی۔ ماسٹر آف لائبریری اینڈ انفارمیشن کا مندرجہ ذیل مکتوب ملا جو انھوں نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ دراصل میں نے کتاب وصول کرتے ہوئے انھیں شکریے کا خط ارسال کر دیا تھا اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو الہ آباد سے کتاب زیر نظر کی اطلاع بھی دے دی تھی۔
ڈاکٹر صاحب موصوف کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی گمشدہ یا مخفی خزانہ مل گیا ہو۔
جب میں رخصت پر لاہور آیا تو گھر سے پتا چلا کہ ڈاکٹر صاحب کے کئی بار فون آ چکے ہیں اور ملاقات کے لیے یاد فرمایا ہے۔

چناں چہ جب میں حاضر خدمت ہوا تو ہندوستان سے سر شیخ عبدالقادر کی تصنیف "Urdu Language and Literature" کی وصول یابی کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''شاہد صاحب! آپ کے پاس جس قدر اردو زبان و ادب کے ضمن میں پہلے سے مضامین و مقالات موجود ہیں انھیں ان تازہ مضامین (لیکچرز) میں شامل کر کے ایک مجموعہ تیار کریں تا کہ انھیں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کی جانب سے شائع کیا جائے۔ میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر کتاب تیار کر دی اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ چناں چہ سولہ مضامین و مقالات اور لیکچروں پر مشتمل یہ کتاب جو ۱۴۵ صفحات پر محیط ہے اکتوبر ۱۹۹۵ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گئی۔ جب مجھے ڈاکٹر صاحب کا فون آیا اور ان کی خدمت میں پہنچا تو میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں ''خوشی کے آنسو تھے''۔ پھر کیا تھا، بغل گیر ہو کر مجھے شاباش دی! یہ دن مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ جی چاہتا ہے کہ وہ خط جو ڈاکٹر صاحب نے دیکھ کر خوشی کا اظہار فرمایا، آپ کی خدمت میں بھی پیش کر دیا جائے تا کہ آپ بھی ملاحظہ فرمالیں اور اس ''انسان'' کو داد دینے میں کنجوسی نہ کریں۔ المختصر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام و انصرام میری مرتبہ کردہ جو کتاب شائع ہوئی اس کا نام "Sir Abdul Qadir on Urdu Literature" ہے۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ سر شیخ عبدالقادر کے الہ آباد میں دیے جانے والے لیکچروں کی ''روح'' تک پہنچنے کے لیے ان کا مطالعہ ضرور کریں۔

My dear Mr. Shahid,

Thank you for your letter of December 13, 1989 acknowledging receipt of the photo copy of the book "Urdu Language and Literature and appreciating my action of meeting your need which forms part of my duty, in loud and glowing terms. In fact there is no need for such appreciation and expression of sense of gratitude. It is the foremost duty of a Librarian to meet the urge for mental food of the intellectual and establish contact between the right reader and the right book at the right time expeditiously. Through God's grace I could discharge this duty to your satisfaction and that's all. Further my view of life is "Service to Man is Service to God." One poet too has rightly said.

گر ہو سکے تو کرے خلق خدا کی خدمت ۔ یہی ساری عبادت ہے یہی ساری بندگی ہے

Thanks for your excellent article, Iqbal and the Arabic Language, which is very interesting and informative.

Now coming to the personal quarry about my relationship with late renowned Dr. Babu Ram Saxena I wish to add that he was my distant relation and I am not his grandson. Late Raja Rai Bal Krishna who was deputy Minister in the court of Oudh during Wajid Ali Shah's reign is my great grand father and luckily I belong to that illustrious family. I am also fond of Urdu Literature, particularly poetry.

Kindly do not hesitate in writing to me for any other assistance which I may render to you.

With best wishes,

Yours sincerely

(R.S. Saxena)

Librarian

۱۹۹۱ء کے اختتام پر میں نے سعودی عرب (ریاض) سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی فرمائش پر ''سر شیخ عبدالقادر (کتابیات)'' کے نام سے ایک کتابچہ ارسال کیا تا کہ اسے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی طرف سے شائع کیا جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے مقتدرہ قومی زبان بھیج دیا تا کہ یہ کتابچہ وہاں سے اشاعت پذیر ہو جائے۔ اس کی اشاعت کا بنیادی مقصد تو افادۂ عام تھا۔ بہر حال ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا جس سے طلبہ، عام قارئین اور محققین مستفید ہوئے اور اس ضمن میں مجھ سے رابطہ بھی کیا۔ یہ کتابچہ برادرم ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی نگرانی میں شائع ہوا جو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ سر شیخ عبدالقادر کی حیات و خدمات کو ولادت تا وفات، دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق کم سے کم صفحات میں سمویا جائے اور ان میں زیادہ سے زیادہ مواد شامل کیا جائے۔ مختصر یہ کہ اس میں سر شیخ عبدالقادر کی حیات و خدمات کا کم سے کم صفحات میں احاطہ کیا گیا ہے۔

☆☆☆

تحریک پاکستان اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے حوالے سے ہم نے ریسرچ اور تحقیق میاں امیرالدین صاحب صدر انجمن حمایت اسلام لاہور سے اجازت لینے کے بعد ۱۹۶۰ء کے اواخر میں شروع کر دی تھی ایک طرف تو ہم سر شیخ عبدالقادر کے خلف الرشید شیخ منظور قادر کے دولت کدہ پر جاتے دوسری طرف انجمن حمایت اسلام لاہور جاتے لیکن انجمن حمایت اسلام لاہور والا کام علامہ اقبالؒ، سر شیخ عبدالقادر اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے حوالے سے بڑا عظیم اور بھاری بھرکم تھا۔ چناں چہ یہ تاریخی نوعیت کا حامل کام جنوری ۱۹۹۲ء میں اختتام پذیر ہوا۔ ہم نے گرامی قدر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی خدمت میں مسودہ ارسال کیا۔ انھوں نے اس کا بھرپور مطالعہ فرمایا اور بعد ازاں ''تعارف'' تحریر فرما کر ہمارے صاحبزادے کو مطلع فرمایا کہ مسودہ لے جائے۔ اس کے بعد اشاعت کا کام تھا۔ سرورق برادرم اسلم کمال بنا چکے تھے۔ کتاب کی اشاعت برادرم رب نواز ملک جنرل منیجر شیخ غلام علی اینڈ سنز کے ذمہ تھی، جو چند ہفتوں کے اندر اندر مکمل ہوئی اور پھر کتاب کی تیاری کی خبر ہم تک پہنچی تو ہم نے خود اس کا استقبال کیا۔ آپ ''تعارف'' ملاحظہ فرمائیے اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے لیے دعائے خیر کیجیے۔

''تعارف''

اسلامیہ کالج لاہور پنجاب میں اسلامی تشخص کی پہلی نشانی ہے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور پنجاب میں غالباً پہلی ایسی

جماعت ہے جس نے تبلیغ اسلام کو اپنا شعار بنایا اور ایسا لٹریچر شائع کرنے کا ڈول ڈالا جس نے عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا مثبت جواب دیا اور مسلمانوں کو تعلیمی لحاظ سے بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انجمن حمایت اسلام نے مغربی علوم کو مسلمانوں کی پس ماندگی کا علاج قرار دے کر سر سید احمد خاں کی ان مساعی کا ساتھ دیا جس نے مسلمانوں کو تعلیمی لحاظ سے جدید علوم سے آشنا کر کے انھیں بیسویں صدی کے پس منظر میں مسلم نشاۃ الثانیہ کا وہ درس دیا کہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے مسلمانوں کی تہذیبی اور علمی شناخت بنتے چلے گئے۔ مدرسۃ المسلمین کے قیام سے لے کر اسلامیہ کالج کی تاسیس تک چند برس ہی میں ایک لحاظ سے وہ جواب مہیا کیا جو عیسائی مشنریوں نے ایف سی کالج اور سناتن دھرم کالج کے نام لیواؤں اور اس نوع کے دوسرے اداروں کی تشکیل کر کے اپنے اپنے مذہبی طبقات کو مغرب کی نئی روشنی سے آشنا کرنے اور تہذیبی اور مذہبی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ادا کیا تھا۔

انجمن حمایت اسلام کی سرگرمیوں کے تین بڑے واضح دائرے تھے۔ پہلا دائرہ اسلام کی تبلیغ کا تھا جس میں انجمن اسلامیہ اور بعض دوسرے ادارے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق برسرِ عمل تھے۔ دوسرا دائرہ مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کا علاج تھا، چناں چہ اسلامیہ ہائی سکولوں کے ذریعے انجمن حمایت اسلام نے اس کام کی ابتدا کی اور لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی اپنی شاخیں قائم کیں تاکہ مسلمان اپنی مذہبی تعلیم کو بھی برقرار رکھ سکیں۔ تیسرا دائرہ انجمن حمایت اسلام کی مطبوعاتی سرگرمیاں تھیں جن میں درسی نوعیت کے علاوہ قرآن کریم اور اس کی تدریس کے بارے میں کتابوں کی نشر و اشاعت ایک اہم اقدام تھا۔

مسلمان ۱۸۵۷ء کے بعد جس پس ماندگی کا شکار تھے اور جو احساس کمتری ان میں پیدا ہو گیا تھا، اسے دور کرنے کے لیے مغربی علوم سے آشنائی ضروری تھی۔ چناں چہ انجمن حمایت اسلام نے تعلیم کے دائرے کو اولین اہمیت دی اور مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ مغرب سے آنے والے علوم کو حاصل کر کے اور اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھ کے مسلمان اپنی پسماندگی کا علاج کر سکتے ہیں۔ یہی اقدام سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کالج کے قیام سے کیا تھا۔ مسلمانوں میں بیداری کی وہ لہر جو تحریک سر سید نے پیدا کی انجمن حمایت اسلام اسی کی ایک توسیعی شکل تھی چناں چہ ۱۸۹۲ء میں انٹر کالج کا قیام عمل میں آیا اور ۱۹۰۰ء تک ڈگری کی کلاسوں کا اجراء ہو گیا۔ غریب اور نادار مسلمان طالب علموں کے لیے سستی تعلیم مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ انجمن حمایت اسلام نے نادار طالب علموں کے لیے وظائف کا اجرا کیا۔ یتیم طالب علموں کے لیے یتیم خانے قائم کیے اس طرح غریب اور متوسط طبقے کے لیے تعلیم کے راستے کھول کر انجمن حمایت اسلام نے مسلمانوں کو بیسویں صدی کے چیلنج کے لیے تیار کیا۔

ایک اور پہلو سے بھی انجمن حمایت اسلام کی مساعی قابل ذکر ہیں کہ اس نے مسلمانوں کو تعلیمی لحاظ سے باثروت بنانے کے علاوہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لیے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ اوائل ہی میں انجمن حمایت اسلام کو بعض ایسے سیاسی مسائل سے دوچار ہونا پڑا جو اس کی بقا کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً اسلامیہ کالج کے الحاق کا مسئلہ اور تحریک ترک موالات۔ ہندوستان میں سیاسی بیداری کی لہر کچھ اس طرح اٹھی تھی کہ تحریک ترک موالات بظاہر مسلمانوں کی خیر خواہی اور خلافت کے مسئلے اس کی شناخت کے نمایاں پہلو تھے لیکن انجمن حمایت اسلام پنجاب یونیورسٹی سے اپنا الحاق توڑ لیتی اور اس میں سیاسی طور پر شریک ہو جاتی تو مسلمانوں کے لیے شاید پنجاب میں سر اٹھانا ممکن نہ رہتا۔

مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج تحریک پاکستان تھا جس میں شروع ہی سے یہ ادارہ شریک رہا ہے۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے تحریک پاکستان کے سرخیل کے طور پر جو خدمات انجام دیں ان کا ذکر کچھ دبے لفظوں میں کیا جاتا ہے حالانکہ پنجاب میں تحریک پاکستان کے مطالبے کو گاؤں گاؤں قریہ قریہ پہنچانے میں اسلامیہ کالج کے طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسلمانوں کے ملی تشخص کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں نے بہت تقویت دی۔ ۱۹۱۵ء کے آس پاس انجمن شبلی کے سامنے چودھری رحمت علی نے پاکستان کا خاکہ پہلی بار پیش کیا۔ ۱۹۲۸ء میں خواجہ دل محمد نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پاکستان کے عنوان سے ایک نظم پیش کی۔ قائداعظم نے پنجاب میں اسلامیہ کالج کو مرکزی اہمیت دی اور کئی دفعہ اسلامیہ کالج کے میدان میں سیاسی جلسے منعقد کیے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا ۲۷واں سالانہ جلسہ جس میں قرارداد لاہور پیش کی گئی اس میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے اہم کردار ادا کیا جس میں اسلامیہ کالج کے طلبہ کی مساعی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ مارچ ۱۹۴۱ء، نومبر ۱۹۴۲ء اور اپریل ۱۹۴۴ء میں قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر نے طلبائے اسلامیہ کالج میں بیداری کی روح پھونک دی اور تحریک پاکستان کے لیے پہلی شہادت بھی اسلامیہ کالج کے ایک طالب علم ''محمد مالک'' نے حاصل کی۔

تحریک پاکستان میں اسلامیہ کالج کا کردار اتنا ہی اہم ہے جتنا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ افراد نے جس طرح مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا آغاز کیا تھا اور ان میں سیاسی بیداری کی روح پھونک دی تھی۔ اسی طرح اسلامیہ کالج کے نامور فرزندوں نے قائداعظم محمد علی جناح کے پیغام کو قریہ قریہ پہنچایا۔ یوں تحریک پاکستان کے اولین مجاہدوں میں اسلامیہ کالج کے طالب علموں کی قربانیاں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ضرورت تھی کہ تحریک پاکستان کے اس پہلو کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ اس سلسلے میں بیدار ملک کے علاوہ محمد حنیف شاہد ہماری خصوصی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تحریک پاکستان کا یہ اہم باب رقم کر کے تاریخ کا ایک اہم گوشہ ہی منور نہیں کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک اہم دستاویز مہیا کر دی ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ اسلامیہ کالج کا یہ پہلو مربوط صورت میں سامنے آیا ہے اور آخر میں بعض اہم دستاویزات کو بھی شائع کیا جا رہا ہے جو اسلامیہ کالج آرکائیوز کا بنیادی حصہ ہے لیکن جس تک عوام کی رسائی ممکن نہ تھی۔ اگرچہ بھٹو کے دور حکومت میں کالجوں کا نیشنلائز کر کے انجمن حمایت اسلام کی ان سرگرمیوں کو بہت نقصان پہنچایا اور انجمن حمایت اسلام آج اختلاف اور کشمکش میں مبتلا ہے، اس کے لیے مسلمانوں کو یہ آئینہ دکھانا بھی ضروری تھا کہ یک جہتی اور خلوص نیت سے کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور باہمی نفاق سے ملت کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب انجمن حمایت اسلام کے مختلف دھڑوں اور سرکاری کالجوں کے لیے ایک آئینہ ہے جس میں ملت اسلامیہ اپنا چہرہ دیکھ سکتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی

۱۷ جون ۱۹۹۲ء

۹۶۲۔ این

سمن آباد لاہور

''اردو پاکستان کی قومی زبان'': جب ہم علامہ اقبالؒ، سر شیخ عبدالقادر اور تحریک پاکستان کے حوالے سے انجمن حمایت اسلام لاہور کا قدیم ریکارڈ چیک کر رہے تھے تو ریسرچ اور تحقیق کے دوران کئی دیگر ممتاز اور قد آور شخصیات کے نام اور ان سے متعلق قیمتی مواد

اور معلومات نظر سے گزریں چناں چہ ریکارڈ محفوظ کرتے چلے گئے۔ علامہ عبداللہ یوسف علی، جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں، سر میاں محمد شفیع، میاں بشیر احمد وغیرہم ہمارے چہیتے موضوعات تھے اپنے دیرینہ اور قدیم کرم فرما ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے ان شخصیات کا تذکرہ کیا تو آپ نے میاں بشیر احمد کی اردو زبان کے حوالے سے خدمات کو سراہتے ہوئے فرمایا، میاں صاحب کی اردو زبان سے متعلق تقاریر و مقالات اور مضامین کو مرتب کر ڈالو۔ چناں چہ ہم نے جب یہ مجموعہ مرتب کر لیا تو آپ نے فرمایا اسے انجمن ترقی اردو کراچی بھجوا دیں۔ میں جناب جمیل الدین عالی کے نام خط لکھ دیتا ہوں، وہ اس کتاب کو شائع کر دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے حکم کی تعمیل میں مسودہ تیار ہو گیا اور آپ کے مشورے سے کتاب کا نام ''اردو۔ پاکستان کی قومی زبان'' طے پایا۔ مختصر یہ کہ انجمن ترقی اردو کراچی نے اسے طے شدہ عنوان سے شائع کیا۔ جمیل الدین عالی صاحب نے دیباچہ تحریر کیا، جب کہ راقم الحروف نے چوبیس پچیس صفحات پر محیط ''تعارف'' کیا جس میں میاں بشیر احمد کی اردو خدمات کا جائزہ پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں کی اردو زبان اور ادب اور پنجاب میں اردو کا تعارف پیش کیا۔ یہ کتاب ۱۹۹۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی اگر چہ یہ ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس کے ذریعے دریا کو کوزے میں بند کیا گیا ہے اور اس کا کلی طور پر ''کریڈٹ'' ڈاکٹر وحید قریشی کو جاتا ہے۔

''مقالات عبدالقادر'': یہ مجموعہ سر شیخ عبدالقادر کے مضامین، مقالات اور خود نوشت سوانح پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل منتخب مضامین و مقالات کا انتخاب ہے جو خود نوشت سوانح، شخصیت اور سوانح اور تنقید اور فن تنقید پر محیط ہے۔ کتاب کے آغاز میں ۳۵ صفحات پر مشتمل بے دیباچہ ہے اور اس کے ۳۴۵ صفحات ہیں جسے ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کے ایما پر مجلس ترقی ادب نے شائع کیا تھا۔ بی۔ اے، ایم۔ اے کے طلبہ، اساتذہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے یہ ایک گنج گراں مایہ ہے۔

''شمس العلماء'': اس موضوع پر تحقیق و تدقیق کا کام ہم نے کئی سال قبل شروع کیا تھا اور ڈاکٹر صاحب قبلہ وقتاً فوقتاً اس کی پیش رفت کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ بالآخر ہم جب جولائی ۲۰۰۳ء میں ریاض (سعودی عرب) سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وطن عزیز واپس آ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے ایک ملاقات میں دریافت فرمایا کہ ''شمس العلماء'' والا کام کہاں تک پہنچا ہے۔ ہم نے تمام تفصیل بالوضاحت پیش کی جس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ''میں سمجھتا ہوں سو کے لگ بھگ شخصیات کے بارے مصالحہ جمع ہونا قابل قدر اور حوصلہ افزا ہے اس کو آخری شکل دیں تاکہ کمپوزنگ کے ساتھ ساتھ پروف ریڈنگ کا کام تسلی بخش طریقے سے ہو جائے اور کتاب پریس بھیجی جا سکے۔'' چناں چہ ہم نے زیر نظر کتاب کو اولیت دی اور سب کام چھوڑ کر ''شمس العلماء'' کے پیچھے پڑ گئے اور جب اسے ختم کر چکے تو ڈاکٹر صاحب کو اس امر کی خبر دی۔ انھوں نے خوشگوار حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''کل سہ پہر EME سوسائٹی آ جائیں، گھر پر کتاب کو آخری شکل دے لیں گے اور پھر اسے طیب اقبال پرنٹرز رائل پارک لاہور بھیج دیں گے۔ ہم نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خوشی خوشی سارے مرحلے طے کیے چناں چہ چند دنوں میں کتاب کی پرنٹنگ پریس مذکور بھیج دی گئی اور ہماری خوشی کی کوئی حد نہ رہی جب ڈاکٹر صاحب نے ٹھیک بارہ روز کے بعد فون کر کے بتایا کہ اتوار کے روز دس گیارہ بجے سوسائٹی آ جائیں اور کتاب مطبوعہ شکل میں دیکھ لیں۔ چناں چہ موعودہ وقت پر ہم ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر پہنچ گئے اور نہ صرف ''شمس العلماء'' کی زیارت کی بلکہ دس نسخے اپنے ہمراہ لے کر گھر لوٹے۔ ''شمس العلماء'' کا سرورق برادر گرامی موجد صاحب کا شاہکار ہے جو نہایت دیدہ زیب

ہے۔ یہ کتاب ۲۲/۸×۱۸ سائز کے ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۰۱ شخصیات کے سوانح اور علمی و ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ڈاکٹر وحید قریشی ایک ماہر تعلیم اور مؤرخ تھے۔ محقق، دانشور، ادیب اور نقاد تھے۔ آپ ایک جامع حیثیات شخصیت کے مالک تھے، رہبر و راہنما ہونے کے ساتھ قدر شناس اور قدر دان بھی تھے، لیکن اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔ چوں کہ "پنجاب کے سرسید" سر شیخ عبدالقادر مدیر مخزن اور پنجاب آبزرور کی نہ صرف ان کی دل میں قدر و منزلت تھی بلکہ ایک "نرم گوشہ" بھی تھا، یہی وجہ تھی کہ بے انتہا دشواریوں اور مخالفتوں کے باوجود "سر شیخ عبدالقادر کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ" کے عنوان کے تحت ڈاکٹریٹ کے لیے میرا تحقیقی مقالہ منظور کروانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور پھر جنوری ۲۰۰۱ء میں جب سر شیخ عبدالقادر کے 'مخزن' کی یاد کو تازہ کرتے اور آگے بڑھاتے ہوئے قائداعظم لائبریری کے زیر انتظام و انصرام مجلّہ "مخزن" کا اجراء کیا تو سر شیخ عبدالقادر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ادارتی نوٹ (اداریے) میں تحریر فرمایا:

"اردو ادب میں جدید ادبی رجحانات کی داغ بیل سر عبدالقادر مرحوم کے ہاتھوں پڑی تھی۔ ۱۹۰۱ء (اپریل) میں مخزن کا اجراء ہوا۔ اسی وسیلے سے انجمن پنجاب کی جدید شعری تحریک نقطۂ عروج تک جا پہنچی۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے جملہ رجحانات اسی فکری تگ و دو کا نتیجہ تھے۔ آج ٹھیک سو سال بعد جب کہ دنیا ایک عالمگیر بستی (Global Village) میں تبدیل ہو رہی ہے، وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ادب بھی اسی سمت میں اپنا مؤثر کردار ادا کرے۔"

قائداعظم لائبریری نے اسی مقصد کے پیش نظر اس مجلّے کے توسط سے ایک ادبی پلیٹ فارم مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے عزائم ۲۰۰۱ء میں بھی وہی ہیں جنھیں لے کر مخزن نے بیسویں صدی کے چیلنج قبول کیے تھے:

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

(اقبالؒ)

جب مخزن منظر عام پر آیا تو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب خاکسار کو نہیں بھولے۔ اگرچہ ہم اس وقت ریاض (سعودی عرب) میں مقیم تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے از راہ لطف و عنایت مندرجہ ذیل دو مکاتیب راقم الحروف کے گھر بذریعہ ڈاک ارسال فرمائے اور تحریر فرمایا کہ "آپ سے درخواست ہے کہ 'مخزن' کے بارے میں اپنی قیمتی آراء سے ہمیں نوازیں۔ آپ سے قلمی تعاون کی بھی استدعا ہے۔"

جناب محمد حنیف شاہد
مکرمی تسلیم!

قائداعظم لائبریری کے ادبی مجلّے مخزن کے دو شمارے آپ کی خدمت میں ارسال کیے جا چکے ہیں۔ امید ہے آپ ان سے

مستفید ہوئے ہوں گے۔

مجلّے کا تیسرا شمارہ (جلد۲ شمارہ۱) پیش خدمت ہے۔آپ سے درخواست ہے کہ مخزن کے بارے میں اپنی قیمتی آرا سے ہمیں نوازیں۔ آپ سے قلمی تعاون کی بھی استدعا ہے۔

مخلص

(ڈاکٹر وحید قریشی)

مدیر مخزن

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ششماہی مخزن کا پہلا شمارہ (جلد اول) جنوری ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا جس کا شائقین اور علم وادب کے ستاروں نے خیر مقدم کیا جب کہ دوسرا شمارہ (جلد اول) جولائی ۲۰۰۱ء میں طلوع ہوا۔اسی طرح جلد دوم کے دو شمارے سنہ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئے اور تیسری جلد کے دو شمارے ۲۰۰۳ء میں چھپے۔بہر حال ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے مطابق ہم نے مخزن کے لیے مندرجہ ذیل مضامین تحریر کیے جو اس تاریخی مجلّے کی زینت ہے۔

☆	سر عبدالقادر اور پنجاب آبزرور	جلد۳ شمارہ۲، بابت ۲۰۰۳ء
☆	مجلّہ مخزن کے مختلف دور	جلد۴ شمارہ۲، بابت ۲۰۰۴ء
☆	سر عبدالقادر اور اردو ہندی تنازع	جلد۵ شمارہ۱، بابت ۲۰۰۵ء
☆	شمس العلما، ڈاکٹر عمر داؤد پوتہ	جلد۶ شمارہ۱، بابت ۲۰۰۶ء
☆	سر عبدالقادر احوال و آثار	جلد۸ شمارہ۱، بابت ۲۰۰۸ء
☆	مولانا ظفر علی خاں کی غیر مدون تحریریں	جلد۹ شمارہ۲، بابت ۲۰۰۹ء

مجلّہ مخزن کی زینت بننے والے یہ تمام مضامین جو ہم نے براہ راست محترم ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمت میں پیش کیے۔ آخری مضمون وہ تھا جو ہم نے وفات کے قبل ڈاکٹر صاحب کو ان کے گھر پر پیش کیا اور اس کی نقل محترم عنایت اللہ صاحب کی خدمت میں ان کے دفتر میں پیش کی تھی۔عنوان ہے: نواب شیخ غلام محبوب سبحانی کی شاعری۔

مکرمی تسلیم!

قائد اعظم لائبریری کے ادبی مجلّے مخزن کے تین شمارے آپ کی خدمت میں ارسال کیے جا چکے ہیں۔امید ہے آپ ان سے مستفید ہوئے ہوں گے۔

مجلّے کا چوتھا شمارہ (جلد۲ شمارہ۲) پیش خدمت ہے۔آپ سے درخواست ہے کہ مخزن کے بارے میں اپنی قیمتی آرا سے ہمیں نوازیں۔ آپ سے قلمی تعاون کی بھی استدعا ہے۔

مخلص

(ڈاکٹر وحید قریشی)

مدیر مخزن

یہ بات قابل ذکر اور قابل توجہ ہے کہ راقم الحروف کو مخزن کے سترہ شمارے بدستور اور تسلسل کے ساتھ موصول ہوتے رہے اور راقم نے ڈاکٹر صاحب کے حکم کی تعمیل میں جو مضامین اور مقالات برائے اشاعت ارسال کیے وہ مجلہ مخزن کی زینت بنے۔ چناں چہ ان تمام مطبوعہ مضامین کی فہرست ان مکاتیب کے آخر میں درج کی جارہی ہے۔

شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مسٹر حنیف شاہد صاحب کے مسودے کو میں نے دیکھا ہے۔ میری دانست میں انھوں نے مواد کی فراہمی اور ترتیب میں بڑی محنت اٹھائی ہے "اقبال اور حمایت اسلام" کی تدوین سے اقبالیات میں خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔

وحید قریشی

18/6/69

مذکورہ بالا مکتوب محترم و مکرم ڈاکٹر وحید قریشی نے ہماری تصنیف "اقبال اور انجمن حمایت اسلام" کے سلسلے میں تحریر فرمایا جس میں کتاب مذکور کے بارے میں اپنے گراں قدر تاثرات کا اظہار فرمایا۔ یہ کتاب انجمن مذکور نے علامہ اقبالؒ کے صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات کے موقع پر ۱۹۷۶ء میں بڑی آن بان اور شان کے ساتھ شائع کی۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، میاں امیر الدین صدر انجمن اور پروفیسر سید وقار عظیم کے کتاب کے بارے میں تاثرات شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک طویل دیباچہ جو راقم نے تحریر کیا ہے کتاب کی زینت ہے۔

عزیز من۔ تسلیم

میں نے آپ کا مضمون علامہ اقبال کی غیر مدون تحریریں دیکھ لیا ہے، ان میں سے پانچ تحریریں غیر مدون تھیں وہ الگ کر دی ہیں، باقی کیفیت یہ ہے:

۱۔ اقبال اور ظفر علی خاں — باقیات اقبال میں چھپ چکی ہے۔

۲۔ تاج کے بارے میں خط 'انوار اقبال' میں شامل ہے۔

۳۔ تقسیم اول — باقیات اقبال میں

۴۔ تاریخ حریت اسلام — انوار اقبال میں

۵۔ زمانے کے بارے میں شعر — رسالہ صحیفہ میں

۶۔ ملکی اتحاد اور اہل قلم کا فرض گفتار اقبال میں

۷۔ صداقت کا تراشا ہوا ہیرا گفتار اقبال میں

۸۔ مخزن والا اقتباس صحیفہ میں

۹۔ اردو مرکز کے بارے میں رائے پروفیسر اقبال کی ہے، علامہ اقبال کی نہیں

۱۰۔ مظفر الدین قریشی کا خط انوار اقبال میں چھپ چکا ہے۔

۱۱۔ اعلیٰ سبز چائے کے بارے میں شعر انوار اقبال میں موجود ہے۔

عزیز من آپ نئے لکھنے والے ہیں آپ کو احتیاط کرنی چاہیے۔

آپ کا مخلص

(ڈاکٹر وحید قریشی)

مدیر صحیفہ

بخدمت جناب محمد حنیف شاہد

لائبریرین، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور

برادرم ڈاکٹر صاحب تسلیم

آپ کا گرامی نامہ مل گیا نقل جناب حاجی ارشد قریشی کے حوالے کر دی ہے۔ مزید کاپیوں کے سلسلے میں وہ کوئی بندوبست کریں گے۔ ''مشاہیر اردو'' والا مسودہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے سپرد کیا ہے انھیں بھی خط کی نقل دے دی ہے۔ ''آل انڈیا مسلم لیگ اور اردو'' کا کام بھی وہی کر رہے ہیں، ان شاءاللہ وہ مفصل خط لکھیں گے۔

والسلام

(ڈاکٹر وحید قریشی)

صدر نشین

بخدمت گرامی جناب محمد حنیف شاہد

اقبال اینڈ قائد سکالر، ڈین شپ آف لائبریریز،

کنگ سعود یونیورسٹی، پوسٹ بکس نمبر ۲۲۴۸۰

الریاض ۱۱۴۹۵ سعودی عرب

ڈاکٹر صاحب کا مندرجہ بالا مکتوب ''آل انڈیا مسلم لیگ اور اردو'' کے حوالے سے ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نے انگریزی

متن کے بغیر صرف اردو ترجمہ شائع کر دیا تھا۔ بعد ازاں ہماری درخواست پر اردو ترجمے کے ساتھ انگریزی متن شامل کر کے طبع دوم شائع کیا گیا تا کہ قارئین انگریزی کے علاوہ اردو سے بھی مستفید ہو سکیں۔

تاریخ ۱۶۔ جولائی ۱۹۸۷ء

مکرمی تسلیم

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ آپ نے ''محمد طفیل ادبی ایوارڈ'' ملنے پر مبارک باد دی۔ اس کرم فرمائی کے لیے ممنون ہوں۔

والسلام

آپ کا

(ڈاکٹر وحید قریشی)

بخدمت گرامی جناب محمد حنیف شاہد

اقبال اینڈ قائد سکالر، ڈین شپ آف لائبریریز،

کنگ سعود یونیورسٹی، پوسٹ بکس نمبر ۲۲۴۸۰

الریاض ۱۱۴۹۵ سعودی عرب

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی گوناگوں اور وقیع خدمات کے اعتراف کے طور پر ''لاہور کے سرسید'' گرامی قدر جناب محمد طفیل مدیر نقوش نے آپ کو ''محمد طفیل ادبی ایوارڈ'' سے سرفراز فرمایا۔ ہم اگر چہ ریاض سعودی عرب میں مقیم تھے، ہمیں جب یہ خبر ملی تو دلی خوشی ہوئی، ہم کسی طور خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے، چناں چہ فوراً ''مبارک بادی'' کا مکتوب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ارسال فرمایا، ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں اسلام آباد میں تھے۔

عزیز من تسلیم

کتاب پڑھ چکا، میٹنگ کا دعوت نامہ بہت جلد پہنچ گیا تھا اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔ کتاب کے بارے میں تاثرات ارسالِ خدمت کروں گا۔ والسلام

آپ کا

(ڈاکٹر وحید قریشی)

جناب محمد حنیف شاہد

پنجاب پبلک لائبریری۔ لاہور

ڈاکٹر وحید قریشی قبلہ نے مذکورہ بالا مکتوب راقم الحروف کی تصنیف ''تحریک پاکستان میں اسلامیہ کالج لاہور کا کردار'' کے ضمن میں تحریر فرمایا۔ آپ نے از راہ لطف وعنایت ۱۷ جون ۱۹۹۲ء کو ''تعارف'' کے عنوان کے تحت اپنے گراں تاثرات ارسال فرما دیے تھے جو زیر نظر مضمون کی زینت بن رہے ہیں۔

۵۰۵/۵۱/۳۹ (ایڈمن) | یکم نومبر ۱۹۹۳ء

جناب محمد حنیف شاہد صاحب

ریاض۔ سعودی عرب

عنوان: تاحیات رکنیت

محترمی، السلام علیکم

مجھے آپ کو یہ اطلاع دے کر بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ اقبال اکادمی کی گورننگ باڈی نے آپ کو اکادمی کا تاحیات رکن مقرر کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کے قیمتی مشوروں اور رہنمائی سے ہم ضرور مستفید ہوتے رہیں گے۔

والسلام

(ڈاکٹر وحید قریشی)

ناظم

ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ ہم اقبال اکادمی پاکستان کے ''لائف ممبر'' (Life Member) بن جائیں۔ چناں چہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کی فرمائش کے مطابق دوامی رکنیت کے سلسلے میں تمام کاغذی کارروائی مکمل کر کے فائل اقبال اکادمی پاکستان کو ارسال کر دی۔ جب گورننگ باڈی نے ہمیں اکادمی کا ''تاحیات رکن'' مقرر کر دیا تو ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ بالا مکتوب بھیج کر ہمیں یہ خوش خبری سنائی۔

QAL/443 | مورخہ ۰۳-۰۹-۲۷

عزیز من حنیف شاہد! تسلیم،

سنا ہے آپ سعودی عرب سے واپس آ گئے، لیکن ابھی تک مجھ سے نہیں ملے۔ میں اب گھر میں دو چار قدم چل لیتا ہوں۔ کسی وقت تشریف لا سکیں تو ممنون ہوں گا۔

مخزن کے لیے دونوں مضمون مل گئے کسی اور پرچے کو نہ بھیجیے۔ اگر آیندہ مجھے براہ راست مقالے بھیج دیا کریں تو مجھ تک

جلد پہنچ جائیں گے، بالا بالا بھیجنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس میں تاخیر ہوتی ہے۔ آپ کے دونوں مضمون یکے بعد دیگرے شائع ہوں گے۔ اس سال کے دونوں پرچے مکمل ہو کر میرے ہاتھ سے نکل گئے ہیں، ظاہر ہے جنوری میں چھاپنے کی نوبت آئے گی۔ آپ کو تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا اور اللہ میاں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

میرے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی درج کر دیا گیا ہے تا کہ آپ براہ راست رابطہ کر سکیں۔ اپنے فون نمبر سے مطلع فرمائیں۔

والسلام

آپ کا

(وحید قریشی)

E-215۔ ای ایم ای سوسائٹی

ڈاکخانہ ٹھوکر نیاز بیگ ملتان روڈ لاہور

فون نمبر 7512724

جناب محمد حنیف شاہد صاحب

170 جہانزیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

گرامی قدر جناب پروفیسر ڈاکٹر عبدالوحید قریشی صاحب، EME-215 سوسائٹی لاہور

جناب عالی!

امید ہے آپ بفضلِ خدا خیر و عافیت سے ہوں گے۔

میں نے ناظم مجلس ترقی ادب، ناظم بزم اقبال لاہور اور نوائے وقت لاہور کے متعلقہ احباب سے 'شمس العلماء' کتاب کے حوالے سے بات کی ہے۔ امید ہے کہ وہ زیر نظر کتاب پر تبصرہ شائع کر دیں گے۔ چناں چہ آپ کی خدمت میں گزارش ہے کہ تینوں اداروں کے لیے ۶ نسخے مرحمت فرمانے کے احکامات صادر فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

والسلام

دعا گو

پروفیسر محمد حنیف شاہد

۲۶ ستمبر ۲۰۰۸

جب ہماری مرتبہ کتاب ''شمس العلماء'' شائع ہوئی تو مختلف اخبارات اور رسائل میں تبصرے شائع ہوئے۔ اندریں حالات ہم نے ڈاکٹر صاحب کو تحریر کیا کہ تبصرے کے ۶ نسخے مرحمت فرمائیں۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب کے حکم کی تعمیل میں برادرم محمد اشرف نے ہمیں ۶ نسخے بھجوائے۔

۳۴۶ مورخہ ۷۔۱۔۹۲ء

عزیزم محمد حنیف شاہد:

تسلیم

آپ کا ارسال کردہ مقالہ پہنچ گیا۔ سابق مقالہ ''کلام اقبال میں احادیث نبوی کا استعمال'' مجلہ اقبال میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کی دو کاپیاں آپ کے بیٹے کو ۱۰۔۱۲۔۹۱ء کو دے دی گئی تھیں۔ امید ہے انھوں نے آپ کو اطلاع کر دی ہوگی۔

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے آپ کی سر عبدالقادر والی کتاب کی کاپیاں چسپاں ہو گئی ہیں۔ اسی سال میں امید ہے کتاب شائع ہو جائے گی۔

نوٹ:۔ آپ نے تعزیت کا خط لکھا اس کے لیے ممنون ہوں۔ ۱۵ دسمبر کے خط میں آپ کا مقالہ مکمل صورت میں مل گیا تھا۔ ہمارے یہاں آف پرنٹس کا دستور نہیں، لیکن بہر حال اب آیندہ ۵ شمارے کھلے رکھ لیے جائیں گے تاکہ سب حضرات کو کم از کم چار چار آف پرنٹس بھیجے جا سکیں۔

والسلام

مخلص

(ڈاکٹر وحید قریشی)

بخدمت گرامی جناب محمد حنیف شاہد

P.O. Box 22480 Riyadh- K.S.A

زیر نظر مضمون ''احادیث نبویؐ کلام اقبالؒ میں مجلہ اقبال بابت جنوری تا اپریل ۱۹۹۱ء، جلد ۳۸ عدد ۱۔۲ صفحات ۱۳ تا ۵۰ شائع ہوا تھا، جب کہ سر عبدالقادر والی کتاب بعنوان "Sir Abdul Qadir on Urdu Literature" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۹۶ء

محترم محمد حنیف شاہد صاحب

السلام علیکم!

آپ کے دو مسودے ''اقبال کی غیر مدون تحریریں (حصہ اول) اور ''دستاویزات اقبال'' (حصہ اول) اشاعت کے لیے متعلقہ شعبہ کے حوالے کر دیے گئے ہیں۔ آپ کا تیسرا مسودہ ''شیخ عبدالقادر کی سیاسی خدمات'' فوری طور پر شائع کرنا ممکن نہیں لہٰذا یہ

مسودہ آپ کی خدمت میں واپس بھیجا جا رہا ہے۔ وصولی پر مطلع فرمائیے گا۔

(ڈاکٹر وحید قریشی)

ناظم

ہمراہ مسودہ:

جناب محمد حنیف شاہد صاحب

۷۰۷ جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ہم نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں کل تین مسودے ارسال کیے تھے۔ دو مسودے علامہ اقبال سے متعلق تھے، جب کہ تیسرا مسودہ سر شیخ عبدالقادر کی سیاسی خدمات کے بارے میں تھا۔ سر شیخ عبدالقادر کی سیاسی خدمات سے متعلق ہمارے چند مضامین ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے جرنل میں شائع ہو چکے تھے اور وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر ہم نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن مدیر مجلّہ کے نام بھیجے تھے۔

افادہ عام کی خاطر ہم ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم و مغفور کی ادارت میں شائع ہونے والے مندرجہ ذیل مجلات میں طبع ہونے والے ان مضامین کی تفصیل پیش کر رہے ہیں جو ہمیں دستیاب ہو سکے ہیں اور جن میں ہمارے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین کی اشاعت صرف اور صرف ڈاکٹر صاحب کی مرہونِ منت ہے اور ایک لحاظ سے ان کے حکم کی تعمیل ہے۔

☆ مجلّہ صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول: علامہ اقبال کی پانچ غیر مدون تحریریں: شمارہ ۶۵ بابت اکتوبر ۱۹۷۳ء: صفحات ۲۳۸ تا ۲۴۱

☆ ایضاً۔ حصہ دوم: اقبال اور عشقِ رسولؐ: شمارہ ۶۶: بابت جنوری ۱۹۷۴ء: صفحات ۳۲ تا ۳۳

☆ اقبالیات (اقبال اکادمی پاکستان): اقبال اور سوامی رام تیرتھ: جلد ۳۴: شمارہ ۴: بابت جنوری۔ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحات ۱ تا ۲۴

☆ اقبالیات: مسلم نشاۃ الثانیہ اور اقبالؒ: جلد ۳۸: شمارہ ۲: بابت جولائی ۱۹۹۷ء۔ صفحات ۱ تا ۴۸

☆ اقبال (بزم اقبال لاہور): احادیث نبویؐ کلام اقبال میں: جلد ۳۸: شمارہ ۱-۲: بابت جنوری۔ اپریل ۱۹۹۱ء صفحات ۱۳ تا ۵۰

☆ اقبال (بزم اقبال لاہور): پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق: جلد ۳۹ / ۴۰: شمارہ ۱/۴ بابت اکتوبر ۱۹۹۲ تا جنوری ۱۹۹۳ء: صفحات ۲۳ تا ۳۵

☆ اقبال (بزم اقبال لاہور): مرزا غالب مدیر مخزن کی نظر میں: جلد ۴۰: شمارہ ۲۰: بابت اپریل ۱۹۹۳ء، صفحات ۴۷ تا ۷۲

☆ اقبال (بزم اقبال لاہور): جہاد: قرآن کریم و حدیث نبویؐ اور کلام اقبال کی روشنی میں: بابت جولائی ۱۹۹۳ء، جلد ۴۰ شمارہ ۳: صفحات ۵ تا ۱۶

☆ اقبال (بزم اقبال لاہور): Sheikh Abdul Qadir And The Punjab Legislative Council

جلد ۴۰ شمارہ ۴: بابت اکتوبر ۱۹۹۳ء: صفحات ۴۷ تا ۹۲

☆ اخبار اردو (مقتدرہ قومی زبان): خصوصی شمارہ: پنجاب میں اردو

علمی اور ادبی دنیا کے تمام شائقین جانتے ہیں کہ اخبار اردو مقتدرہ قومی زبان کا ترجمان ہے جو ایک طویل عرصہ سے قابل قدر اور قابل رشک خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی ایک طویل عرصہ تک اس کے صدر نشین کے طور پر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ مارچ۔اپریل ۲۰۰۴ء میں اخبار اردو کا خصوصی شمارہ ''پنجاب میں اردو'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا جو ۴۴۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس خصوصی شمارے کے آخری صفحہ یعنی ۴۴۴ پر ڈاکٹر وحید قریشی کے مجلّہ ''مخزن'' پر مکمل ایک صفحے کا تبصرہ تھا اور زیر تبصرہ مخزن کا شمارہ ۲۰۰۳ء کا آخری شمارہ تھا۔ یہ خصوصی شمارہ جلد نمبر ۲۰ اور شمارہ نمبر ۳ اور ۴ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی خصوصی درخواست / حکم پر ہمارے مندرجہ ذیل مضامین اس کی زینت بنے (جو ہم نے ارسال کیے تھے)

☆ اردو زبان پنجاب میں: جلد ۲۰: شمارہ ۳۔۴: صفحات ۲۹۰ تا ۲۹۵

☆ اصلیت زبان اردو (مصنفہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرتبہ راقم صفحات ۲۹۶ تا ۳۰۲

☆ میاں محمد شاہ دین ہمایوں (مصنفہ سر عبدالقادر) مرتبہ راقم: صفحات ۳۱۸ تا ۳۲۰

☆ پنجاب کا سرسید: شیخ عبدالقادر مصنفہ راقم صفحات ۳۲۱ تا ۳۴۱

☆ سر عبدالقادر: ایک ادبی رہنما مصنفہ راقم صفحات ۳۴۲ تا ۳۴۸

ڈاکٹر وحید قریشی بنام مشفق

مرتبہ: خواجہ عبدالرحمٰن طارق

۲۲۔۱۔۱۹۶۳

برادرم مشفق خواجہ صاحب

وعلیکم السلام۔ آپ کا گرامی نامہ ملا۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ بخیر و عافیت کراچی پہنچ گئے ہیں۔ یہاں جب آپ قیام پذیر تھے تو طبیعت کچھ علیل سی تھی، اب فرمائیے مزاج کیسا ہے؟

حال میں اورینٹل کالج ہی میں پیر حسام الدین راشدی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، وہ چاہتے تھے کہ میں بھی انجمن کی کتابوں کے سلسلے میں کچھ کام کروں، چناں چہ میں نے تین کتابوں کے نام انھیں لکھے، جو غالباً آپ کو ارسال کر چکے ہیں۔ ان میں نقش کے تذکرے کا خاص طور پر اشتیاق ہے۔ ''میر حسن'' آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ نئی اشاعت کے لیے اس میں کانٹ چھانٹ کا ارادہ ہے۔ پہلا باب اور آخری باب یک سر خارج کرنا چاہتا ہوں۔ بعض آرا بھی بدلنی ہیں۔ مثلاً افسوس کے بارے میں بعض بیانات خارج کرنے ہوں گے۔ اس بارے میں آپ کا مشورہ بھی درکار ہے۔ 'صحیفے' کے تازہ شمارے میں شیر علی افسوس پر مقالہ آپ کی نظر میں گزرا ہوگا۔ یہ تبدیل شدہ آرا پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کا دوسرا حصہ آج کل لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں بھی آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ''مطالعۂ حالی'' چھپے تو چند ماہ ہوئے تھے، اب اس کی جلد بندی ہو گئی ہے۔ عنقریب آپ کے حصے کی کاپی ارسال کروں گا۔ قومی زبان میں تبصرے کے لیے ایک کاپی علیحدہ بھیجی جائے گی۔

کہیے یونیورسٹی میں ریڈر اردو اور ریڈر فارسی کی اسامیوں کا کیا ہوا۔ آج کل کس مرحلے پر ہے؟

میں اپریل کی تعطیلات سے قبل کیا آؤں گا، اگر چہ ان چھٹیوں میں بھی پتا نہیں موقع ملتا ہے یا نہیں۔ بہر حال اس کی نوبت ضرور آئے گی۔ کتابوں کے علاوہ اس کا مقصد آپ کے ساتھ چند لمحے گزارنا ہوگا۔

چند ماہ پہلے انجمن کی ارسال کردہ کتابوں ہی سے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے قدیم اردو اور مضامین سلیم اور اورینٹل کالج میگزین میں ریویو کے لیے میرے سپرد کر دی ہیں۔ ابھی لکھ نہیں پایا۔ بہر حال آیندہ شمارے میں ریویو نظر سے گزریں گے۔

والسلام

آپ کا

وحید قریشی

ملاحظہ گرامی مشفق خواجہ صاحب

انجمن ترقی اردو، اردو روڈ کراچی

۵۔۴۔۱۹۶۵

برادرم!

آپ کا گرامی نامہ مل گیا تھا لیکن میرا کام اس سے پورا نہیں ہوا۔ گنج خوبی۔ جامع ....[۱] اور سحر البیان کے مطبوعہ نسخوں کے سنین طباعت اور چھاپے خانوں کی تفصیلات بھی درکار تھیں۔ اور سحر البیان کے مخطوطے کے بارے میں بھی یہ معلوم کرنا باقی ہے کہ وہ کس سنہ کا نسخہ ہے۔ میں گنج خوبی کو اور جامع ....[۲] کو 'مجلس ترقی ادب' کے لیے ترتیب دے رہا ہوں۔ سحر البیان میں مثنویات میر حسن کی دوسری جلد میں آئے گی۔ سحر البیان کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے، اس پر الگ سے ایک مضمون لکھ رہا ہوں جو نذر رحمان میں شائع ہوگا۔ اُس میں اس رائے کا اظہار کر رہا ہوں کہ یہ سحر البیان کا اولین مسودہ ہے اور میر حسن کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ کیا آپ کی نظر سے میر حسن کی کوئی تحریر گزری ہے؟ اگر ایسا ہو تو مجھے ضرور مطلع کیجیے۔ سحر البیان کے قلمی نسخے کے بارے میں مولوی عبدالحق کا ایک خط میرے پاس ہے، جس میں انھوں نے اس نسخہ کا سنہ کتابت ۱۱۹۹ھ دیا ہے۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو میرے لیے یہ نسخہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن نسخے کو دیکھ کر مجھے تفصیلی معلومات دیجیے۔ انجمن کی مطبوعات کی مکمل فہرست چھپ گئی ہو تو بھیجیے۔ ہاں یاد آیا ایک سلسلے کے کچھ خطوط آپ کے پاس تھے، میری یہ امانت مجھے بھیج دیں تو نوازش ہو گی۔ فوری طور پر ضرورت ہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو میں زیارت کے لیے خود کراچی حاضر ہو جاؤں۔ بہر حال آپ کی فوری توجہ میرے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔[۳]

آپ کا

وحید قریشی

بخدمت جناب مشفق خواجہ صاحب

اسسٹنٹ سیکرٹری، انجمن ترقی اردو، اردو روڈ کراچی

برادرم خواجہ صاحب

سلام علیکم۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ تذکرہ ہمیشہ بہار (قلمی) واپس بھیجا تھا اور وہ بھی انشورنس کر کے (مالیت ایک ہزار روپیہ) اور A.D کے ساتھ لیکن رسید ابھی نہیں ملی۔ واپسی ڈاک لکھیے کہ نسخہ آپ کو مل گیا یا نہیں؟

میں نے متن کی تصحیح کر لی ہے اور صرف چھ، سات مقامات حل طلب رہ گئے ہیں۔ ان کے لیے ''سفینۂ خوش گو'' (مطبوعہ پٹنہ) درکار ہے۔ آپ عاریتاً یا تو اپنا نسخہ بھیج دیں یا پیر صاحب (حسام الدین راشدی) سے استدعا کریں کہ وہ اپنا نسخہ مجھے چند دن کے لیے روانہ کر دیں۔ اس کے علاوہ آپ یہ بھی سعی کیجیے کہ اس کی ایک کاپی میرے لیے پٹنے سے بھی مہیا ہو جائے۔ اخلاص ؒ کے حالات لکھ رہا ہوں۔ مخزن الغرائب، گل رعنا، انیس العاشقین، نشترِ عشق دیکھ چکا ہوں۔ مجمع النفائس میں اس کا موجود نہیں۔ اپنے ہاں، انجمن کے کتب خانے میں دیکھیے شاید کسی تذکرے میں ذکر موجود ہو۔ اس کے شاگرد واودے جان بہار کا سنہ وفات بھی مطلوب ہے۔ مجھے قدرت اللہ گوپاموی، کے تذکرے نتائج الافکار اور ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی ''فارسی'' ادب میں ہندوؤں کا حصہ، میں ۱۱۴۳ھ سنہ وفات بہار ملا ہے لیکن میں اس سے مطمئن نہیں۔ میرا قیاس ہے کہ ۱۱۳۶ھ کے بعد ہی کوئی تاریخ ہوگی۔ اس کی تصدیق کر کے مجھے جلد لکھیے۔

۳۱ جنوری کو کراچی میں گلڈ کا جلسہ ہے، میں آؤں گا تو تذکرہ، دیباچہ اور ہفت قلزم کے اوراق بھی لیتا آؤں گا۔

بھائی صاحب۔۔۔۔ کچھ فرمائشیں تھیں، فرداً فرداً لکھتا ہوں:

۱) تاریخ ادب اردو (جلد اول)۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالقیوم

۲) کتالوگ بانکی پور لائبریری، پٹنہ از عبدالمقتدر

۳) Reports of Indian Records Commission (پورا سیٹ)

۴) دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد (دوسری جلد) پہلی جلد میرے پاس موجود ہے۔

۵) سفینۂ خوش گو۔ طبع پٹنہ

۶) الف۔ عیارستان / قاضی عبدالودود (صاحب) پٹنہ

ب۔ نشتر و سوزن / قاضی عبدالودود (صاحب) پٹنہ

۷) الف۔ لطائف السعادت / آمنہ خاتون، بنگلور

ب۔ نوادر / آمنہ خاتون، بنگلور

۸) آپ نے خوش معرکۂ زیبا کا متن 'مجلس ترقی ادب' کو روانہ کرنے کا وعدہ کیا تھا اور میں تاج صاحب سے بات بھی کر چکا تھا لیکن آپ نے ابھی تک روانہ نہیں کیا۔ جتنا حصہ ہو چکا ہے وہی بھیج دیں تا کہ چھپائی شروع ہو جائے۔

۹) دیوان آبرو اور سحر البیان کے فلم ابھی تک نہیں ملے۔

بھابھی کی خدمت میں سلام۔ آپ کی بھابھی سلام کہتی ہیں۔ کل ان کا ایم اے کا نتیجہ نکل گیا ہے۔ سیکنڈ کلاس میں پاس ہوئی ہیں اور نمبر ۳۹۵ حاصل کیے ہیں۔ اس سال یہاں کا نتیجہ بہت سخت رہا، ساڑھے نو سو طالب علموں سے صرف ایک آدمی کی فرسٹ کلاس ہے۔ سو، سوا سو کی سیکنڈ کلاس، دو سو، ڈھائی سو تھرڈ کلاس اور باقی فیل۔ فرسٹ ڈویژن ۴۲۰ سے شروع ہوتی ہے۔ اول آنے والے طالب علم نے ۴۲۲ نمبر حاصل کیے ہیں۔ ان حالات میں میرا خیال ہے ۳۹۵ نمبر کچھ ایسے برے نہیں ہیں۔

مسٹر ذوالفقار احمد واپس آ گئے ہیں اور آپ کا سلام پہنچانے آئے تھے۔

آپ کا
وحید قریشی
۵/۱/۶۷

۲۶۹/۴ راین سمن آباد ۵
لاہور نمبر ۴

برادرم خواجہ صاحب

سلام علیکم۔ آپ کے دو خط اس سے قبل ملے تھے۔ اب تیسرا املا، جس میں "عتاب زیر لبی" کا انداز ہے:۔

خراب لذت آنم کہ چوں شناخت مرا　　　عتاب زیر لب کرد، خانہ ویراں گفت

آپ کا شکوہ بجا۔ پہلے خط کے بعد میں نے آپ کے لیے مقالے کا ڈول ڈالا۔ آپ کا ارسال کردہ تذکرہ مل گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں مضمون لکھنا شروع کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شیفتہ کے تذکرے کے سلسلے کی ساری بحث کا احاطہ کیا جائے، لیکن ہوا یہ کہ میرے ایک شاگرد (جواب شاگردی سے منحرف ہیں) نے یونیورسٹی لائبریری سے 'ارمغان' کو کہیں کسی کونے میں رکھ دیا تا کہ استفادہ نہ کر سکوں۔ اسی دوران آپ کو بھی اس کتابچے کی ضرورت پڑی اور آپ نے یہاں والوں کو لکھا۔ میں نے اس خیال سے کہ آپ اب خود اس موضوع پر کام شروع کر چکے ہوں گے، اسے چھوڑ کر ایک دوسرا موضوع لیا۔ سنتا ہوں کہ ارمغان آپ کو یہاں سے مہیا نہ ہو سکی لیکن آپ نے کراچی سے حاصل کر لی۔ اب کیا آپ خود اس بارے میں کچھ لکھ رہے ہیں یا میں اسے پورا کر دوں۔ اس صورت میں آپ کو ارمغان یا اس کی نقل مجھے روانہ کرنا ہوگی۔

آپ کا دوسرا خط فرمائشی تھا۔ اس کی تعمیل میں، میں نے پبلشر کو ممتاز حسین صاحب کا پتا نوٹ کرایا تھا اور انھوں نے کاپی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا مجھے افسوس ہے کہ انھوں نے نسخہ نہیں بھیجا۔ میں آج ہی ممتاز صاحب کو نسخہ خود بھیج رہا ہوں۔ آپ میری طرف سے معذرت کیجیے گا۔ آپ کو مثنویاتِ حسن کی جلد اول بھیج رہا ہوں اور سحر البیان پر ایک مقالے کا آف پرنٹ بھی۔ پسند آئے تو ریویو بھی کر دیجیے اور آف پرنٹ کو قومی زبان میں چھاپ دیجیے تا کہ مناسب حلقوں تک پہنچ جائے۔ رسالہ اردو میں آپ کا ریویو (مقالات میر) دیکھا تھا۔ اس میں آپ نے ایک ذرا سی شرارت تو ضرور کی تھی لیکن مجموعی اعتبار سے کتاب کو آپ نے پسند کیا اور میری

محنت ٹھکانے لگی۔

رسالہ اردو کے لیے دوسرا موضوع جس پر میں نے مضمون لکھ لیا تھا گلزار ارم از میر حسن کے ایک نسخے پر تھا جو یونیورسٹی لائبریری کی ایک بیاض میں شامل اور ۱۲۱۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ میرے اسی شاگرد کرم فرما کو اس کی بھی خبر ہوگئی تھی اور کچھ عرصے کے لیے یہ قلمی نسخہ بھی کتابوں میں آگے پیچھے کر دیا گیا۔ اب سنا ہے کہ اس بیاض پر اور میرے مطبوعہ نسخے پر ایک مضمون لکھ کر ان صاحب نے آپ کو ارسال کیا ہے۔ اور رسالہ اردو میں ان کا مقالہ شائع ہو رہا ہے۔ اکرام چغتائی نے یہاں کے بعض صاحبوں کے ساتھ مل کر یہ مہم چلا رکھی ہے اور اس کا پس منظر یہاں کی سیاست ہے جس سے آپ بھی باخبر ہیں۔ بہر حال میں نے مقالہ مکمل کر لیا ہے۔ معلوم نہیں آپ اس کو شائع کرنا پسند کریں گے یا اکرام چغتائی کا مقالہ شائع ہوگا۔ میں آپ کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں، اس کے بعد رسالہ ارسال خدمت ہوگا۔

بھائی ۔۔۔ میری دو فرمائشیں اور بھی ہیں۔ وہ کب پوری ہوں گی؟ ۔۔۔ سحر البیان قلمی ۱۱۹۹ھ کا عکس یا مائی کرو فلم ۔۔۔ دیوانِ آبرو کا عکس یا فلم ۔ اور سب سے اہم بات، اردو رپورتاژ پر کراچی یونیورسٹی اور اس کے مقالے کی فہرست کتابیات۔

اب آپ کو مناقشۂ تذکرہ شیفتہ پر مضمون لکھ کر دوں یا آپ نے خود کچھ لکھ ڈالا ہے؟

گلزار ارم (قلمی نسخہ) پر نوٹ لکھوں گا۔ اکرام چغتائی کا مقالہ چھپے گا؟ ۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ اکرام کا مقالہ مجھے بھیج دیں اور وہ مضمون میرے اختلافی نوٹ کے ساتھ شائع ہو ۔۔؟

ہماری بھابھی سے سلام اور قبلہ خواجہ صاحب کی خدمت میں آداب۔ ممتاز حسین صاحب سے ریویو کا شکریہ۔

آپ کا

وحید قریشی

﴿۵﴾

ذاتی

برادرم۔

سلام علیکم۔

آپ کے دونوں خط مل گئے ۔ بھائی ستانے کا سوال ہی نہیں۔ آپ کو یہاں کے حالات کا علم نہیں۔ میں بہت پریشان اور دل برداشتہ ہوں۔ جس جس سے بھی سابقہ پڑا ہے، اسی نے دکھ دیا ہے۔ آپ کبھی لاہور آئیں گے تو تفصیلات بتاؤں گا۔ اب عالی[۲] ہی کو لیجیے۔ ان حضرات سے پورا تعاون کیا اور آپ کے ہاں جو گفتگو ان سے ہوئی تھی، اس کی روشنی میں، میں نے ان سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کی، لیکن ان حضرت کی ''سیاست'' کا وہی عالم ہے۔ پچھلے دنوں انھوں نے روس وفد بھیجا اور وعدہ خلافی کرتے ہوئے مجھے بے خبر رکھا۔ اب دو وفد جا رہے ہیں، ان کے بارے میں بھی رازداری سے کام لیا جا رہا ہے۔ یہاں تو میں عالی سے روابط کی وجہ سے اچھا نہ سمجھا جاؤں اور وہاں دوستوں کا یہ طریق ہو۔ عالی یہاں دوسرے لوگوں سے تو مشورہ کرتے ہیں لیکن مجھے مسلسل نظر انداز

کرتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو آپ ان سے بات کیجیے۔ نہیں تو میرا راستہ ان سے بالکل الگ ہو جائے گا۔ اور بعد میں نہ انھیں مجھ سے گلہ ہونا چاہیے اور نہ مجھے ان سے۔ امید ہے کہ آپ ان معاملات میں ضرور عالی سے بات کریں گے۔ میرا ان دنوں کراچی نہ آنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ پنڈی میں مجھے حالات کا علم ہو گیا تھا۔ اسی لیے میں نے آنا ملتوی کر دیا۔[8]

۱۔ اقبال نامہ آج ارسال خدمت ہوگا۔

۲۔ ہمیشہ بہار اب اسی طرح چھاپ دیجیے۔ دیباچہ تو اصل مسودے کے بغیر اور میں اس کا اظہار اس سے قبل بھی کر چکا ہوں۔ میرے آج کل کے حالات بھی مجھے لکھنے پڑھنے سے روکے ہوئے ہیں۔ کتاب کے پروف آپ دیکھ رہے ہیں تو میرا اطمینان ہے کہ متن ٹھیک شائع ہوگا۔ شاہ ایران والے قصے کے بعد آپ مجھے چھپا ہوا متن بھیج دیں گے تو دیباچہ بھیجوں گا، وہ بعد میں شامل کر دیجیے گا۔ شاہ ایران کو میرے دیباچے کی ضرورت نہ ہوگی۔[9]

۳۔ خوش معرکہ زیبا کا معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ آپ کسی وقت مجھ سے فون پر بات کیجیے تو بتاؤں گا۔

۴۔ ....[10] کا اشاریہ ابھی تیار نہیں ہوا، اس لیے کتاب کی جلدیں نہیں بندھیں۔ جیسے جلدیں بندھیں، میں آپ کی خدمت میں نسخہ ارسال کر دوں گا۔

۵۔ (ا) 'صحیفے' پر آپ کی رائے (تحریری) درکار ہے۔

(ب) صحیفے پر تبصرہ رسالہ اردو یا قومی زبان میں فرمائیے۔

(ج) آپ کا مقالہ کب ملے گا؟

(د) کیا 'صحیفے' کا اشتہار رسالہ اردو میں بلا معاوضہ چھپ سکتا ہے۔ صحیفے میں تبادلے کے طور پر رسالہ اردو کا اشتہار ہم چھاپنے کو تیار ہیں۔

(ہ) صحیفے کے نئے مدیر آیندہ احمد رضا کی جگہ کلب علی فائق[11] ہوں گے۔ اس سے میرا کچھ کام سہل ہو جائے گا۔

(و) آپ کے لیے صحیفہ (شمارہ ۱۱ تا ۴۰) میں نے محفوظ کر لیا ہے۔ خواجہ قیوم[12] صاحب سے کہیے کسی وقت میرے مکان سے حاصل کر لیں اور آپ کو بھجوا دیں۔

۶۔ دیوان اکبر کا فوٹو بھجوا دیجیے۔ 'سحر البیان' کا بھی فلم بن سکتا تو اچھا تھا۔

کراچی آنا میرے لیے فی الحال ناممکن ہے۔

احباب سے سلام

آپ کا

وحید قریشی

﴿۶﴾

۶۸-۲-۲

برادرم مشفق خواجہ

سلام علیکم۔

ابھی آج اپنے کاغذات کا جائزہ لے رہا تھا کہ ۶۷-۸-۱۳ کا ایک خط آپ کے نام نکل آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس زمانے میں پوسٹ نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ میرے کراچی نہ آسکنے کے بارے میں مشوش رہے۔ ان میں ایک دو فرمائشیں بھی ہیں، وہ ابھی تک باسی نہیں ہوئیں یعنی قابلِ عمل ہیں۔ رسالہ اردو اور تاریخ و سیاسیات کے پرچے اگر سٹاک (میں) ہوں تو بھیج دیں۔

گلڈ کے سلسلے میں پچھلے دنوں (جب آپ سے بات ہوئی تھی) میرے خیال میں ملتان کے ریاض انور کی طرف سے ایک نوٹس بھی بھجوایا گیا تھا کہ فوراً مستعفی ہو جاؤں کیوں کہ میرا اور اعجاز بٹالوی کا جھگڑا تھا جس سے گلڈ کی بدنامی ہوئی ہے اور دوسرے یہ کہ میں گلڈ سے سفر کا الاؤنس لیتا ہوں جب کہ سواری میری اپنی ہے۔ یہ معاملہ غالباً شوکت صدیقی اور قتیل شفائی کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ عالی اس معاملے میں اپنی لاتعلقی بتاتے ہیں۔ اب اگرچہ قصہ ٹھنڈا پڑ چکا ہے لیکن اس سالانہ جلسے پر (۳۱ جنوری) پھر کسی شرارت کا امکان تھا۔ وہاں کے حالات کی اطلاع دیجیے۔ مزید یہ بھی معلوم کیجیے کہ عالی کا اس قصے سے کچھ واسطہ تو نہیں؟ میں آپ کے خط کا انتظار کروں گا۔ میرا خیال ہے شوکت کچھ ٹھیک آدمی نہیں ہیں [۴۱]۔ آپ کی 'غیر سرکاری' رائے کیا ہے؟

آپ کا
وحید قریشی

﴿۷﴾

BAL/S/U/1985

۶۸-۶-۱۵

برادرم تسلیم

کتابیں آپ کو مل گئیں اور ان کی شکل وصورت آپ کو پسند آئی۔ پبلشرز کی محنت ٹھکانے لگی، وہ آپ کا خود شکریہ ادا کرے گا۔ اگر باقی کتاب میں کوئی جان ہو تو مطلع کیجیے۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ کی طبیعت صرف ''قصائی'' میں تیز ہوتی ہے۔ شاید اس لیے آپ میری کتاب پر تبصرہ نہیں کرتے۔ یہ شکایتاً نہیں کہتا، اندیشہ ہے کہ پھر آپ زیادہ بیباک ہو جائیں گے۔ ترخان محبت کے سلسلے میں، پروف میں اصلاح ہو گئی تھی۔

عتیق صدیقی صاحب کا خط تاج صاحب کی خدمت میں پیش کروں گا۔ تذکرہ بے جگر نقل ہو رہا ہے، جیسے ہی فارغ ہوتا ہے، آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔

افتخار صاحب سے آج ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فہرست کے چودہ صفحے عنایت کیے، عکس بنوانے ہیں، کچھ دن لگیں گے۔

ایک مجبوری کی وجہ سے یہ خط آپ کو ٹائپ سے بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی تلافی دوسرے خط میں کی جائے گی اور ہاتھ سے لکھا

جائے گا اور اپنی تمام مہارت کے باوجود نہیں پڑھ سکیں گے۔

آپ کا مخلص
وحید قریشی
(ڈاکٹر وحید قریشی)
مدیر صحیفہ

جناب مشفق خواجہ صاحب
انجمن ترقی اردو، اردو روڈ
کراچی نمبرا

۸

پیارے بھائی مشفق خواجہ[۱۴]

سلام علیکم

امید ہے آپ کو یہ اطلاع تو مل چکی ہوگی کہ مجلسِ ترقی ادب کے ''مردِ آہن'' عبدالغفار نے تاج صاحب[۱۵] کو دھمکانے کے لیے استعفیٰ دیا تھا، جو منظور ہو گیا ہے۔ اس ماہ کے آخر تک فارغ کر دیا جائے گا۔ بہت سے انکشافات کی توقع ہے۔ ایک بڑی لعنت دور ہوئی۔ اب مجلس کی حالت پہلے سے بہتر ہو جائے گی۔ 'خوش معرکہ' کی ڈمی بھی آپ کو عنقریب مل جائے گی۔

صحیفہ ابھی تک آپ کے مقالے کا منتظر ہے۔ اکتوبر کے شمارے میں کلامِ نگار شائع کیا جا رہا تھا۔ ایک طائر کی زبانی اطلاع ملی ہے کہ درگا پرشاد (اکرام چغتائی) نے بھی یہ کلام لے کر صحیفہ سے پہلے شائع کرنے کی ٹھانی ہے۔ فنون کے دسمبر کے شمارے میں یہ مقالہ شامل ہو رہا تھا۔ اب اس کی کتابت شدہ کا پیاں آپ کو روانہ ہوئی ہیں کہ قومی زبان میں چھپیں۔ اس (سے) قبل بھی یہ شخص آپ کی معرفت نگار میں ایک چیز چھاپ چکا ہے۔ اگر اب کے نگار والا مقالہ شائع ہوا تو مجھے از حد رنج ہوگا۔ اس شخص (کو) لاہور میں بعض صاحبوں نے آلۂ کار بنا رکھا ہے، جو کالج کے علاوہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ صحیفہ میرے ہاتھ میں رہے۔

میری ذاتی پریشانیوں کی کیفیت یہ ہے کہ میری تنخواہ یونیورسٹی کے دفتر نے تین سو روپے ماہوار کے حساب سے کم کر دی تھی، چناں چہ پچھلے ماہ میں نے تنخواہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ دو تین روز ہوئے وائس چانسلر کے احکامات کے مطابق تنخواہ پوری واگذار ہوئی ہے لیکن ابھی معاملہ طے نہیں ہوا۔ اور فنانس ڈیپارٹمنٹ کو رجوع کیا گیا ہے۔ میرے حق میں دعا کیجیے۔ ایک صاحب جنھیں آپ اپنے ہاں بلا رہے تھے، اس معاملے میں میرے در پے ہیں۔ درگا پرشاد (اکرام چغتائی) کو بھی مضمون نے اکسا رکھا ہے۔ ہمارے ہاں پروفیسر کی ایک اور آسامی نکلی ہے۔ میں نے بھی درخواست دے رکھی ہے۔

آپ کا
وحید قریشی

﴿۹﴾

BAZ/S/113/1985

۱۲فروری ۱۹۶۹ء

بھائی صاحب۔ تسلیم،

مضمون مل گیا۔ اگرچہ طویل ہے، مگر ضرور چھاپوں گا۔ ضخامت دیکھ کر تو شبہ ہوا تھا کہ عبادت [۱۶] صاحب کے کسی بھائی بند کا مضمون ہے لیکن آپ نے واقعی غضب کیا ہے۔ آپ یہ مضمون کسی اور کو نہ دیجیے۔ اس کے ساتھ کوئی ایک آدھ تحریر کا عکس بھی شامل کرنا ہو تو بھیج دیجیے۔ صحیفہ آپ کو بھیجا جا چکا ہے، اس کے بارے میں اپنی تفصیلی رائے بھیجیں۔ تحریری ہو تو اچھا ہے، دفتری کام میں بھی آ جائے گی۔

بندۂ خدا میری کچھ کتابوں پر آپ کا ریویو آنا چاہیے تھا۔ رسالہ اردو میں یا قومی زبان میں، لیکن ابھی تک چشم براہ ہوں۔ مزید مواد ابھی تک نہیں ملا۔ توجہ فرمائیے۔ [۱۷]

والسلام

آپ کا مخلص

(ڈاکٹر وحید قریشی)

مدیر صحیفہ

جناب مشفق خواجہ صاحب

سیکرٹری انجمن ترقی اردو، اردو بورڈ، کراچی نمبر۱

﴿۱۰﴾

۱۰۵۔ املتاس روڈ

واہ چھاؤنی

برادرم خواجہ صاحب

تسلیم۔ آپ کا ارسال کردہ مقدمہ دو تین روز ہوئے دیکھ کر مجلس کو بھیج چکا ہوں۔ تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ چند جملے میں نے حذف کر دیے تھے۔ پروف آپ کے پاس آئے گا تو دیکھ لیجیے گا۔ [۱۸]

صحیفے میں آپ کے مقالے کی دوسری قسط شائع ہو رہی ہے۔ میں لاہور سے باہر ہوں، اس لیے اس کا پروف میں نے دفتر کو لکھا ہے آپ کو بھیج دیں۔ جلد دیکھ کر واپس بھیجیے گا۔

میرے حالات آپ کو پیر صاحب [۱۹] سے معلوم ہو چکے ہیں۔ آپ کا عطیہ اجازت کے بغیر کیسے استعمال ہو؟ ہاں جب تک تصویر کے بجائے اصل مسودہ ہاتھ میں نہ ہو بات کیسے بنے۔ آپ اصل یا تو عاریۃً بھیج دیں یا کوئی مزید مواد ارسال کریں تو بات بنے۔

معاملات طول پکڑ گئے ہیں۔ اب بات آپ جیسے دوستوں پر منحصر ہے۔[۲۰]

آپ لاہور آئیں تو مفصل باتیں ہوں گی۔ کیا اس کا امکان مستقبل قریب میں نہیں؟ یہاں کے زخم دل دکھاؤں۔ عجیب لوگوں سے سابقہ پڑا ہے۔ عبادت صاحب[۲۱] نے وائس چانسلر کو لکھا ہے کہ وحید قریشی کا دماغی توازن ٹھیک نہیں اور یہ کہ اسے پڑھانا نہیں آتا، حیران ہوں لوگ ذاتی معاملات میں کیسے کیسے حربے استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال ان صاحبوں سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔

آپ کا

وحید قریشی

بملاحظہ

مشفق خواجہ صاحب

اسسٹنٹ سیکرٹری، انجمن ترقی اردو

اردو روڈ، کراچی

﴿۱۱﴾

۱۸ مارچ سنہ ۱۹۸۴ء

فون دفتر ۸۵۳۳۸۲

گھر ۸۵۱۳۳۷

محب گرامی تسلیم۔

مشہور مورخ مرزا علی اظہر کے حالات ارسال خدمت ہیں۔ ۸۴ سال کی عمر میں اہم مورخ مصائب کا شکار ہے۔ اس کے لیے چیئرمین، اکادمی ادبیات کو بھی لکھا ہے۔ اگر ان کے تاحیات وظیفہ یا فیلوشپ کا بندوبست ہو جائے تو ایک اہم شخصیت کا آخری زمانہ اطمینان سے گزر جائے گا۔

والسلام

آپ کا

(ڈاکٹر وحید قریشی)

صدر نشین

بخدمت گرامی

جناب ڈاکٹر محمد افضل صاحب

وفاقی وزیر تعلیم

وزارت تعلیم، حکومت پاکستان، اسلام آباد

حواشی

۱۔ ناقابلِ خواندگی

۲۔ ...... ایضاً......

۳۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خطوط بنام مولوی عبدالحق، جن کا مواد مکتوب نگار کے لسانی تعصب کا آئینہ دار ہے۔

۴۔ کشن چند اخلاص (کاشمیری)

۵۔ اس خط پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے۔ لفافے پر ۷ جنوری ۶۷ء کی مہر ثبت ہے۔

۶۔ جمیل الدین عالی

۷۔ ایک فوجی آمر کے "پالتو" شاعروں اور ادیبوں نے گلڈ کو سیاست کا اکھاڑا بنا رکھا تھا۔ مکتوب نگار اور دوسرے صاحبانِ علم و ادب نے آہستہ آہستہ گلڈ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور کچھ عرصے بعد یہ ادارہ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں تاریخ کے کوڑا دان کا رزق بنا۔

۸۔ خط پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے۔ لفافے پر جنرل پوسٹ آفس کراچی کی مہر کی تاریخ ۱۴ جولائی ۶۸ء ہے۔

۹۔ "ہمیشہ بہار کا کام ہو رہا ہے۔ ۲۷ اکتوبر کو شہنشاہ ایران کی تاج پوشی پر یہ تذکرہ انجمن کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔ جناب ممتاز حسین اس موقع پر ایران جائیں گے۔" (مشفق خواجہ کا خط بنام مکتوب نگار مکتوبہ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۷ء)

۱۰۔ ناقابلِ خواندگی

۱۱۔ کلب علی خاں فائق

۱۲۔ خواجہ عبدالقیوم، مکتوب الیہ کے برادر بزرگ

۱۳۔ شوکت صدیقی مرحوم راقم کے ہمراہ اکثر سی ویو کے مقام پر سمندر کے کنارے چہل قدمی فرماتے تھے۔ راقم کا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ نہایت وضع دار اور محبت کرنے والے بزرگ تھے۔

۱۴۔ اس خط پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے، لفافے پر جنرل پوسٹ آفس کراچی کی مہر کی تاریخ ۱۳ اگست ۶۸ء ہے۔

۱۵۔ پیر حسام الدین راشدی

۱۶۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی

۱۷۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳

۱۸۔ مکتوب الیہ کے مرتب کردہ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کا مقدمہ

۱۹۔ پیر حسام الدین راشدی

۲۰۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳

۲۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی

مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر وحید قریشی

انجمن ترقی اردو

۵۔۱۔۶۶ء

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

ایک طویل عرصے کے بعد آپ نے مہرِ سکوت کو توڑا اور ازراہِ کرم ایک خط لکھا تھا، اب پھر وہی عالم ہے۔ میرے سابقہ خط کی جواب طلب باتوں کے بارے میں آپ اگر کچھ لکھ سکیں تو ممنون ہوں گا۔

''ارمغان'' کو میں نے ''اردو''[۱] میں شائع کر دیا ہے۔ یہ پرچہ چند روز میں آپ کو مل جائے گا۔ کیا قومی زبان[۲] کا ''بابائے اردو نمبر'' آپ کو ملا؟

اکرام چغتائی صاحب نے لاہور سے مثنوی گلزارِ ارم کے مطبوعہ اور قلمی (مکتوبہ ۱۲۱۸ھ) نسخوں کے اختلافات ایک مضمون کی صورت میں بھیجے ہیں کہ انھیں قومی زبان میں چھاپ دیا جائے۔ مضمون کا لہجہ شریفانہ اور مواد معلوماتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس مضمون کو چھاپ دوں۔[۳]

''اردو'' کے لیے آپ نے کچھ نہیں بھیجا۔ میرا ایک شعر سنیے۔

ہم سے ہے تیری شانِ تغافل کا اعتبار
شاید اسی سبب سے تجھے یاد آئیں ہم

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

﴾۲﴿

محترمی و مکرمی۔ آداب

حسب روایت آپ نے خط نہیں لکھا، لیکن تذکرہ ہمیشہ بہار[۴] کی رسید تو ارسال فرمائی ہوتی۔ یہ تو پرایا مال ہے، جس دن سے تذکرہ پوسٹ کیا ہے، اسی دن سے رسید کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ ایک مہینے میں اصل سے نقل کا مقابلہ کرلیا جائے گا۔ اب یہ مہینہ ختم ہوگیا ہے۔ توجہ فرمایئے۔ جن لوگوں کا یہ مخطوطہ ہے انھوں نے تقاضے کرنے شروع کردیے ہیں۔ میں نے یہاں اس کی اشاعت کے انتظامات مکمل کرلیے ہیں۔ آج پیر حسام الدین راشدی صاحب[۵] سے گفتگو ہوئی تھی، انھیں بھی اس کی فوری اشاعت پر اصرار ہے۔

آپ کو جن مخطوطات کی فلموں کی ضرورت ہے، ان کو میں نے مائیکروفلم بنانے والوں کو دکھادیا ہے۔ یہ کام عنقریب ہوسکتا ہے، لیکن اس کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ آپ میرے ہر خط کا فوراً جواب دیں۔ آپ اگر جواب نہیں دیں گے تو میں بھی مائیکروفلم تیار نہیں کراؤں گا۔ کہیے کیسی شرط ہے؟

''اردو'' کے لیے آپ نے کوئی مضمون نہیں بھیجا، میں نے گزارش کی تھی کسی کتاب پر تبصرہ ہی بھیج دیجیے لیکن آپ نے اس پر بھی توجہ نہیں کی۔

آمنہ[۶] کے نام بھابھی صاحبہ کا خط ملا تھا، آمنہ آج کل اپنی بہن[۷] کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہیں ورنہ وہ خط کا جواب فوراً دیتیں۔ ہم دونوں کی طرف سے بھابھی صاحبہ کی خدمت میں آداب۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۲۹-۱۱-۶۶

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

۱۴-۱-۶۷ء

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

پہلے آپ کا خط ملا اور پھر عید کارڈ۔ ان عنایات کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میری طرف سے بھی عید مبارک قبول کیجیے۔ آپ کی بیگم صاحبہ کی کامیابی کی خبر سن کر خوشی ہوئی، میری اور آمنہ کی طرف سے آپ اور بیگم صاحبہ اس کی بھی مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ کے

آنے کی اطلاع باعث مسرت ہے۔ ان شاء اللہ مطلوبہ کتابوں اور مائیکروفلمز کا انتظام کر رکھوں گا۔ یہ سب چیزیں آپ کو مل جائیں گی۔
کشن چند اخلاص کے تذکرے کا مخطوطہ[8] مجھے مل گیا ہے۔ شکریہ۔ بہاء الدین بشیر[9] نے نساخ کے تذکرے[10] پر حواشی لکھے ہیں۔ اس میں اخلاص کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ نظر آئے۔

''اخلاص تخلص کشن چند کشمیری۔ جائے ولادت لکھنو ہے۔

اشک چھڑکاؤ کرے ہے، مژہ جھاڑے ہے مکاں
کوئی مرزا منش آنکھوں میں رہا کرتا ہے''

مجھے معلوم نہیں کہ یہ الفاظ آپ کے لیے کس حد تک مفید ہوں گے۔ خوش معرکہ زیبا[11] کے ۴۳۰ صفحات تاج[12] صاحب کی خدمت میں ارسال کر چکا ہوں۔ باقی اس ماہ کے آخر تک بھیج دوں گا۔

پروفیسر وزیر الحسن عابدی[13] صاحب کے پاس قادر بخش صابر کے تذکرے[14] کا ایک ایسا نسخہ ہے، جس پر بشیر کے حواشی ہیں۔ اگر عابدی صاحب آپ کو یہ تذکرہ چند روز کے لیے دے دیں تو میرا کام بن جائے گا۔ میں انھیں علیحدہ خط بھی لکھ رہا ہوں، جو منسلک ہے۔ از راہِ کرم انھیں پہنچا دیجیے اور تذکرہ ان سے لے لیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۱۴-۱-۶۷ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

اشد ضروری

محترمی و مکرمی۔ آداب

ایک خط لکھ چکا ہوں، امید ہے ملا ہوگا۔ یہ خط ایک ضروری کام سے لکھ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مجلس نے طبقات الشعراء (شوق)[15] شائع کر دیا ہے، اس کا ایک نسخہ ارسال فرمایئے۔ یہ تذکرہ یہاں بازار میں نہیں آیا اور مجلس والوں کو لکھتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔ مکتبہ ادب جدید والوں کو خط لکھا تھا، انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ اتنی زحمت کیجیے کہ مجلس میں کسی سے کہہ کر ایک نسخہ وی پی کرا دیجیے۔ اگر مجلس والوں کو وی پی کے لیے کہا تو وہ سمجھیں گے یہ ''حسنِ طلب'' ہے۔ اگر آپ ایسا سمجھیں تو کوئی مضایقہ نہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۱۳۔۵۔۶۷ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

محترمی و مکرمی۔ آداب

آپ تو بالکل بھول گئے۔ ۱۶ راگست کو آپ کا شدید انتظار تھا اور عین ملنے کے وقت تار ملا کہ آپ نہیں آ رہے۔ اب بتائیے شکوہ کروں تو کیسے؟

میر حسن کی مثنوی [16] کا جو مخطوطہ انجمن میں ہے وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اس کا فوٹو بن سکے۔ مائکروفلم کا بھی کوئی فائدہ نہیں، اس لیے کہ مخطوطے کی شکستگی، دریدگی اور آب رسیدگی کا تقاضا ہے کہ اس سے براہِ راست استفادہ کیا جائے۔

آبرو [17] کے دیوان مکتوبہ ۱۱۴۴ھ کے فوٹو نکلوا کر انھیں مجلد کرالیا ہے۔ آپ کا جواب آنے پر ارسال کر دوں گا۔ دوسرے مخطوطے کا فوٹو کرانا بیکار ہے۔ آپ ذرا مختلف کیٹلاگ دیکھ کر لکھیے کہ آبرو کے دیوان کے نسخے کہاں کہاں ہیں، میں یہ سب منگوا دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ انجمن کا مخطوطہ قدیم ترین ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے متن بنا کر کام شروع کر دیجیے۔

ہمیشہ بہار کا کام ہو رہا ہے۔ ۲۷ را کتوبر کو شہنشاہِ ایران کی تاج پوشی پر یہ تذکرہ انجمن کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔ جناب ممتاز حسن اس موقع پر ایران جائیں گے۔ آپ اس کا مقدمہ جلد از جلد لکھ ڈالیے۔ چھپے ہوئے صفحات کا انتظار نہ کیجیے۔

اب ایک ضروری کام۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اقبال نامہ (مرتبہ شیخ عنایت اللہ) کا ایک ایڈیشن ایسا بھی چھپا تھا کہ جسے بعد میں ضائع کر دیا گیا۔ اس میں ممنون حسن خاں بھوپالی [18] اور سرراس مسعود [19] کے نام اقبال کے کچھ خاص قسم کے خط تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ ایڈیشن آپ کے پاس ہے۔ کیا آپ چند روز کے لیے (بذریعہ بیمہ شدہ پارسل) یہ نسخہ مجھے بھیج سکتے ہیں؟

''اردو ڈائجسٹ'' میں آپ کا جو سفر نامہ شائع ہوا تھا اس کے فالتو تراشے اگر آپ کے پاس ہوں تو بھیجیے۔ ممنون ہوں گا۔

''اردو'' کے جولائی کے شمارے میں ''گلشنِ سخن'' [20] پر میرا تبصرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ادیب صاحب نے اس کا جواب لکھنے سے انکار کر دیا ہے۔ انھوں نے ایک خط میرے نام لکھا ہے جس میں انہوں نے بیشتر اعتراضات کو تسلیم کرلیا ہے، اور باقی کے بارے میں لکھا ہے: ''لکھنے کو تو بہت کچھ لکھ سکتا ہوں، لیکن کیا فائدہ۔''

سنا ہے شوق کا تذکرہ [21] چھپ گیا۔ تبصرے کے لیے بھجوائیے۔ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۱۵۔۹۔۶۷ء

﴿۵﴾

جناب والا۔ آداب

سات سو میل دور بیٹھے ہوئے نیاز مندوں کو اتنا ستانا بھی اچھا نہیں۔ آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ حالاں کہ میں نے سخت تاکید کی تھی، آپ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے جب خط کا جواب نہ ملے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ سب سے پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں شاید مکتوب الیہ پر بوجھ ہو گیا ہوں۔ ازرہِ کرم میرا خط سامنے رکھیے اور جواب سے نوازیے۔ مختصراً پھر عرض کرتا ہوں۔

''اقبال نامہ'' کا پہلا ایڈیشن آپ کے پاس ہے۔ ازرہِ کرم چند دن کے لیے بذریعہ رجسٹری بھیج دیجیے۔

''طبقات الشعراء'' کی طباعت کی خبر پہنچ چکی ہے۔ مگر یہ تذکرہ ابھی تک بازار میں نہیں آیا۔ مجلس کی چند کتابیں موصول ہوئی تھیں لیکن ان میں یہ تذکرہ شامل نہیں تھا۔

''ہمیشہ بہار'' کا مقدمہ جلد از جلد ارسال کیجیے۔ یہ کتاب ۱۶ اکتوبر کو ایران کے سفارت خانے کے حوالے کر دی جائے گی۔ اگر اس وقت تک آپ کا مقدمہ نہ ملا تو پھر بغیر مقدمے ہی کے اس معاملے کا تصفیہ ہو جائے گا۔ آپ کو جو کچھ لکھنا ہے، مختصر لکھ بھیجیے، اب اتنا وقت نہیں ہے کہ آپ اس پر تفصیلی مقدمہ لکھیں۔ آپ کے پاس نوٹس ہوں گے، مقدمہ تیار کر ڈالیے۔ اب تک تذکرے کے صرف ایک سو صفحے چھپے ہیں۔ آپ کے حواشی میں بڑی گڑبڑ ہے اور اس وجہ سے رات کو ایک بجے تک مجھے خود پروف پڑھنے پڑتے ہیں۔

''خوش معرکہ زیبا'' کا متن میں نے تیار کر لیا ہے، کل بذریعہ ڈاک مجلس کو بھیج رہا ہوں۔ سنا ہے مجلس کی یہ شرط ہے کہ مقدمہ اور حواشی مل جائیں تو طباعت شروع ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو بڑا غضب ہوگا، اس لیے کہ جب تک متن چھپ نہ جائے یہ دونوں چیزیں تیار نہیں ہو سکتیں۔ میرے پاس سارا مواد موجود ہے لیکن اسے مطبوعہ متن کو سامنے رکھ کر ہی ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ ازرہِ کرم تاج صاحب پر یہ بات واضح کر دیجیے۔ میں ان شاء اللہ متن کی طباعت کے ساتھ ساتھ حواشی لکھ کر بھیجتا رہوں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۱۔۱۰۔۶۷ء

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

﴿۶﴾

محترمی و مکرمی۔ آداب

ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی تھی تو آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ ہمیشہ بہار کا مقدمہ بھیج رہا ہوں۔ آج پندرہ دن ہو گئے، وعدہ وعدہ ہی رہا۔ خیر اب بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو میں نے یہ کیا ہے کہ تذکرے کے جو صفحات چھپے ہیں، انھیں رسالہ اردو میں شامل کر لیا ہے۔

اقبالنامے کی دونوں جلدیں مل گئیں۔ یہ تو میرے پاس بھی ہیں۔ مجھے تو اس ایڈیشن کی ضرورت ہے۔ جس میں بعض صفحات حذف کیے گئے تھے۔ کیا یہ وہی ایڈیشن ہے، اس سلسلے میں آپ کو جو کچھ معلوم ہو لکھیے۔

قبلہ تاج صاحب کا خط آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ سالِ رواں کی سرکاری امداد واگزار ہونے کے بعد 'خوش معرکہ زیبا' کی طباعت شروع ہوگی۔ اب آگے آپ جانیں اور آپ کا کام۔

طبقات الشعرا مل جائے تو بڑا کرم ہوگا۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۶۷/۱/۲۵ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

﴿۷﴾

محترمی و مکرمی۔ آداب

یکے بعد دیگرے آپ کے تین گرامی نامے ملے، بے حد شکریہ۔ گلڈ کے معاملہ میں آپ نے جن لوگوں کے نام لکھے ہیں، ان میں سے کسی کو اپنا خیر خواہ نہ سمجھیے۔ آپ کو جو نوٹس ملا ہے اس میں بھی کچھ ''ادھر کا اشارہ'' ہوگا۔ جناب عالی، آپ سے گزارش ہے کہ آپ گلڈ کی گندی سیاست کو فوراً طلاق دیں، یہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ گلڈ خود غرضوں، جاہلوں اور بے کاروں کی آخری پناہ گاہ ہے۔ اور آپ میں کوئی ایسی صفت نہیں ہے جس کی بنا پر آپ گلڈ میں رہیں۔ گلڈ کے کسی رکن کا آپ کو نوٹس بھیجنا، آپ ہی کی نہیں، ان سب لوگوں کی توہین ہے جو آپ سے رشتۂ نیاز مندی رکھتے ہیں۔ میں نے جو کچھ معلوم کیا ہے اس کے مطابق آپ یہاں سے کسی سے خیر کی توقع نہ رکھیے۔۔۔ اور اپنی باتوں کا جواب سنیے:

۱۔ ہمیشہ بہار کے جو اجزا چھپ گئے ہیں، ان پر نظر ڈال لیے۔ غلطیاں ہوں تو غلط نامہ بنا دیجیے۔ تذکرے کی طباعت اسی مہینے میں مکمل

ہو جائے گی۔ آپ اس پر مقدمہ فوراً لکھ دیجیے گا۔ مطبوعہ اجزا میں اکبرالدین [۲۲] کو حیدرآباد بھیج رہا ہوں۔ وہ اس کا مقابلہ کتب خانہ آصفیہ کے نسخے سے کریں گے۔ ان اختلافات کو آخر میں ضمیمے کی صورت میں دے دیا جائے گا۔

۲۔ صحیفہ [۲۳] کا اشتہار دونوں پرچوں میں چھپ جائے گا اور تبصرہ بھی۔ اشتہار آپ ایسا بنا دیجیے جو مستقل چھپتا رہے۔ قومی زبان کے اشتہارات جلد ہی بھیج دوں گا۔

۳۔ صحیفہ کے لیے بہاءالدین بشیر اور اس کی تذکرہ نگاری پر ایک مضمون لکھا ہے، جلد ہی بھیج دوں گا۔ آپ نے تبصرے کے لیے فرمایا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو دیوانِ آبرو (مرتبہ محمد حسن) پر تبصرہ کر دوں۔ بڑے مزے کا تبصرہ ہو گا نیز بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی۔

۴۔ قومی زبان کا عبدالحق نمبر ارسال خدمت ہے۔

۵۔ اردو اور تاریخ وسیاسیات [۲۴] کے مطلوبہ شماروں میں سے جو ہوں گے، وہ ارسال خدمت کر دیے جائیں گے۔

آج کل میں شب و روز خوش معرکہ حواشی کی تدوین میں مصروف ہوں۔ طباعت مکمل ہوتے ہی حواشی بھیج دوں گا۔ آپ میرا کام جب دیکھیں گے خوش ہوں گے، لیکن مجھے خوشی اس وقت ہوگی جب آپ چھپنے سے پہلے کام پر نظر ڈالیں۔ ہاں ایک ضروری بات یہ ہے کہ میں نے تذکرے کا جو مسودہ بھیجا ہے، اس میں ص ۱۴۹ پر حافظ عبدالرحمٰن احسان [۲۵] کا ذکر ہے۔ اس میں ایک طویل عبارت جو شاید دو تین صفحے تک ہے (انتخابِ کلام سے پہلے تک) وہ علیحدہ کروا لیجیے اور اس پر احسان لکھنوی [۲۶] کا نام لکھوا دیجیے۔ داصل نسخہ پٹنہ کے حاشیہ نگار (اغلباً خود ناصر) نے حافظ احسان اور احسان مرثیہ گو کے حالات کو یک جا کر دیا ہے۔ میں نے مسودے کے مذکورہ صفحے پر حاشیہ دیا ہے، یہ عبارت نسخہ پٹنہ کے حاشیے کا اضافہ ہے۔ یہ ساری اضافہ شدہ عبارت احسان لکھنوی سے متعلق ہے۔ بعد میں یہ الگ عنوان کے تحت آئے گی۔

جواب کا انتظار رہے گا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۶۸-۲-۳ء

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے گلڈ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس قسم کے ادارے ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جنھیں دنیا میں کوئی کام نہ ہو۔

ہمیشہ بہار کے آخری صفحوں کی نقل مل گئی، اتفاق سے آج کل آخری صفحات ہی کمپوز ہو رہے ہیں۔ عنقریب تذکرے کے تمام مطبوعہ اجزا آپ کو اور صدیقی صاحب کو بھیج دوں گا۔

صحیفہ کے لیے بہاء الدین بشیر پر مقالہ کچھ دنوں تک تیار ہو جائے گا۔ آج کل دراصل سارا وقت خوش معرکہ زیبا کے حواشی لکھنے میں صرف ہو رہا ہے۔ اس تذکرے میں تقریباً ساڑھے سات سو شاعر ہیں اور میں نے سبھی شاعروں پر مفصل حواشی لکھے ہیں۔ ان حواشی سے بے شمار باتیں منظر عام پر آئیں گی۔ متن کی طباعت شروع ہو۔ پھر میں اسی اعتبار سے حواشی بھیجتا جاؤں، لیکن ممکن ہے ابھی شاید یہ کام شروع نہیں کیا۔ مجھے بار بار کہتے ہوئے اچھا نہیں لگتا اور پھر یہ بھی تو ہے کہ اگر مجلس نہیں چھاپے گی تو اور بیسیوں ذرائع ہیں۔ کتاب چھاپنا یا چھپوانا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔

تذکرہ شاہ کمال [۲۷] تو بہت کام کی چیز ہے۔ اسے آپ جلد سے جلد ایڈٹ کر ڈالیے۔ شاعروں کے حالات اگرچہ مختصر ہیں، لیکن بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی دوسرے تذکرے میں نہیں۔ میں نے آپ کے نسخے میں مطلوبہ معلومات لے لی ہیں۔ لاہور آتے ہوئے ساتھ لے آؤں گا۔ توقع ہے کہ اگلے مہینے لاہور آنا ہوگا۔ نسخہ دل کشا [۲۸] کا فوٹو آپ نے بنوایا ہے؟

میں آج کل اپنے ذاتی کتب خانے کو مرتب کر رہا ہوں، صرف اسی کے لیے ایک مکان خریدا ہے۔ [۲۹] بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو ایک سے زائد ہیں۔ ان کو الگ رکھ رہا ہوں۔ آپ جب کبھی کراچی آئیں گے تو یہ آپ کو تحفتاً پیش کروں گا۔ [۳۰]

مجھے معاصر [۳۱] کے تین شماروں نمبر ۷، نمبر ۸، نمبر ۹ کی شدید ضرورت ہے۔ اگر آپ کے پاس ہوں تو بذریعہ رجسٹری عنایت کر دیجیے۔ استفادے کے بعد فوراً واپس کر دوں گا۔ اگر پرچے نہ ہوں تو پھر مسرت افزا [۳۲] (کتابی شکل میں) ارسال کر دیجیے۔ قاضی صاحب نے اس تذکرے کا مفصل مقدمہ لکھا ہے جو اب کے اردو میں شائع ہو رہا ہے۔

'معاصر' اور 'مسرت افزا' کے سلسلے میں آپ کی توجہ کا پیشگی شکریہ۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۶۸/۳/۱۷ء

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

گرامی نامہ مل گیا تھا۔ ممنون ہوں۔ ایک علیحدہ پیکٹ میں "ہمیشہ بہار" کے فارم ارسال ہیں۔ از رہِ کرم مقدمہ جلد از جلد ارسال فرمائیے۔

جمیل جالبی صاحب کو یہ شکایت ہے کہ آپ جب سے 'صحیفہ' کے مدیر مقرر ہوئے ہیں، ان کو "صحیفہ" نہیں مل رہا۔ جالبی صاحب کی شکایت دور کیجیے کیوں کہ وہ بہت کام کے آدمی ہیں۔

عتیق صدیقی صاحب کے سلسلے میں کیا ہوا۔ مطلع فرمائیے۔

اردو کے غالب نمبر کے لیے آپ تیاری کر رکھیں۔ اس کی فارسی شاعری کے کسی پہلو پر آپ کو لکھنا ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۱۸/۷/۶۸ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی

لاہور

﴿۱۱﴾

محترمی۔ تسلیم۔

آپ میرے خط کا جواب نہیں دیتے۔ خدا کرے آپ کی پریشانیاں ختم ہو چکی ہوں۔ اگر آپ کا خط آنے میں تاخیر ہو جائے تو سو سو طرح کے گمان گزرتے ہیں۔ آٹھویں دسویں آپ کا خط ضرور آنا چاہیے۔

''ہمیشہ بہار'' کا مقدمہ عنایت ہو۔ بڑا کرم ہوگا۔ مقدمہ نہ ملنے کی وجہ سے کتاب کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔

'خوش معرکہ زیبا' کے مطبوعہ اجزا مل گئے، شکریہ۔ یہاں ''بکف چراغ دارد'' ۳۶؎ کی بڑی دھوم ہے۔ اس کے چند نسخے بھجوایئے، اگر ہو سکے تو۔۔۔۔۔

یہاں کے اخبار ''ڈان'' میں محمد علی صدیقی کتابوں پر تبصرے کرتے ہیں۔ انھیں مذکورہ کتاب پر تبصرہ کرنے کی خواہش ہے، ان کا پتا یہ ہے:

محمد علی صدیقی صاحب، ۴۲ ہمایوں کالونی، وحید آباد، گولی مار۔ کراچی۔ ۱۸

آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اب اکتوبر کے آخر میں اس کا بھی امکان پیدا ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ خوب باتیں ہوں گی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۱۶۔۹۔۶۸ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، لاہور

محترمی و مکرمی۔ آداب

میں یہاں آتے ہی بیمار ہو گیا۔ اس کی وجہ سے خط نہ لکھ سکا۔ یہ خط گھر سے لکھ رہا ہوں۔

لاہور میں آپ کی وجہ سے میرا وقت بہت اچھا گزرا۔ اس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ اگر آپ اور ڈاکٹر غلام حسین [۳۷] لاہور میں نہ ہوتے تو لاہور میں میرا دل ہی نہ لگتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ سے قربت میری زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ کاش زندگی میں ایسے لمحے آئیں جب میں زیادہ سے زیادہ آپ سے قریب رہ سکوں۔ ہمارے معاشرے میں علم اور خلوص دو متضاد چیزیں ہیں۔ اہلِ علم خلوص سے تہی اور مخلص لوگ علم سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ آپ میں یہ دونوں خصوصیات۔۔ علم اور خلوص۔۔ یک جا ہیں۔

آپ کے والد صاحب قبلہ کا کیا حال ہے، امید ہے اب وہ خیریت سے ہوں گے۔ میری طرف سے مزاج پرسی فرمایئے۔

آپ نے چلتے وقت جو کام لکھ کر دیے تھے، وہ سب جلد ہی پورے ہوں گے۔ اگر میں بیمار نہ پڑتا تو یہ کام کب کے ہو چکے ہوتے۔

اس بیماری سے ایک فائدہ ہوا کہ میں نے غالب سے متعلق مواد یک جا کر لیا ہے، ان شاء اللہ اگلے مہینے کے آخر تک ایک مضمون کی صورت میں یہ سب کچھ بھیج دوں گا۔

''ہمیشہ بہار'' کا مقدمہ جلد از جلد ارسال فرمایئے۔ اس کی شدید ضرورت ہے۔ مقدمہ نہ ہونے کی وجہ سے کتاب شائع نہیں ہو سکتی اور اس طرح میری یعنی انجمن کی کارگزاری پر بھی اثر پڑتا ہے۔

ڈاکٹر باقر صاحب [۳۸] سے کتابیں تو لے کر بھیجیے۔

آمنہ آپ کو اور آپ کی بیگم صاحبہ کو سلام لکھواتی ہیں۔ وہ آپ کی بیگم صاحبہ کو الگ خط بھی لکھیں گی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۳۔۱۱۔۶۸ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

مکرمی ومحترمی۔ آداب۔

تذکرۂ بے جگر کے مزید صفحات ملے۔ شکریہ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب [۳۹] سے کئی روز ہوئے بات کر لی گئی تھی۔ اب دیکھیے وہ کیا لکھتے ہیں۔ توقع تو یہی ہے کہ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ خدا کرے۔

آج ایوب قادری صاحب [۴۰] سے معلوم ہوا کہ آپ غالب نمبر دو حصوں میں شائع کریں گے۔ تلامذہ سے متعلق مضامین دوسرے حصے میں ہوں گے۔ میرا مضمون [۴۱] صغیر بلگرامی [۴۲] کے تعلق سے ہے، اس لیے خوشی ہوئی کچھ اور وقت مل گیا۔

یہاں خوامخواہ اردو کا غالب نمبر نکالنے کی مصیبت میرے گلے آن پڑی ہے۔ میرا قطعاً ارادہ نہیں تھا، مگر انجمن کے صدر کی خواہش ہے کہ یہ نمبر ضرور نکلے، لہٰذا مجبوراً ارادہ کرنا ہی پڑا۔ لیکن ارادے اور عمل میں کوسوں کا فاصلہ حائل ہے، جو لوگ مضمون لکھتے، سو وہ آپ کے لیے لکھ رہے ہیں یا لکھ چکے ہیں۔ بتائیے میں کیا کروں؟ سخت پریشان ہوں۔

'ہمیشہ بہار' کا مقدمہ؟؟؟؟؟

'بہار الشعرا' آپ کو مل گیا ہوگا۔ مطلع کیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۶۔۱۲۔۶۸ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

محترمی ومکرمی۔ تسلیم۔

ایک خط پرسوں لکھ چکا ہوں۔ آج نہایت باوثوق ذریعے سے معلوم ہوا کہ حیدر آباد والے ڈاکٹر صاحب [۴۴] دوسرے صاحب کی سفارش کر چکے ہیں۔ وہ محض مروتاً اور اخلاقاً مجھ سے وعدہ کرتے رہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر بہت اونچی سطح سے اثر ڈالا گیا، اس کے مقابلے پر میرا یا کسی اور کا کچھ کہنا کوئی اثر نہیں رکھتا۔ جس ذریعے سے مذکورہ اطلاع ملی، اسی ذریعے سے یہ بھی میں نے معلوم کرایا کہ انھوں نے آخر ایسا کیوں کیا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ''وہ صاحب دو سال بعد ریٹائر ہو جائیں گے، اس کے بعد یہ خود بخود پروفیسر ہو جائیں گے۔''

یہ سب کچھ سن کر مجھے جو دکھ ہوا ہے، اس کا اندازہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۱۸۔۱۲۔۶۸ء

﴿۱۵﴾

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

بہت دنوں سے آپ کا کوئی گرامی نامہ نہیں آیا، آٹھ دس روز بعد ایک چند سطری خط ضرور لکھ دیا کیجیے، آپ سے جو محبت و عقیدت ہے، اس کا آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ اگر بہت دن تک خط نہ آئے تو بڑی بے چینی رہتی ہے۔ قبلہ والد صاحب کی خیریت سے بھی آگاہ کیجیے۔

پرسوں سنگِ میل [۴۵] والے صاحب آئے تھے، ان سے آپ کی خیریت معلوم ہوئی۔ یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آج کل آپ کا زیادہ وقت ''کارپردازی'' میں گزرتا ہے، اس موٹر سائیکل پر ایک دفعہ میں نے بھی آپ کے ساتھ ''سفر پُر خطر'' کیا تھا، راستے بھر ڈرتا رہا تھا۔ اب اطمینان ہوا کہ لاہور آؤں گا تو موٹر سائیکل کا سفر نہ کرنا پڑے گا۔ [۴۶]

یہ بھی معلوم ہوا کہ نسخۂ شیرانی [۴۷] کے ساتھ آپ کا مقدمہ شائع نہیں ہو رہا۔ یہ لاہور والے بھی کیا عجیب لوگ ہیں، جب اس قسم کی بات سنتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں کہ میں لاہور میں نہیں ہوں۔

مقدمہ بھیجے ہوئے کوئی دو ماہ ہو گئے، اس کی خیریت سے مطلع فرمائیں، آخر یہ چھپے گا بھی، یا 'خوش معرکہ' بھی نسخہ شیرانی بن جائے گا۔ پرسوں 'صحیفہ' مل گیا تھا، یہاں سب لوگ آپ کے کام کو سراہتے ہیں۔ خصوصاً ڈاکٹر شوکت سبزواری [۴۸] بہت تعریف کر رہے تھے۔ ''اردو'' کا نیا شمارہ چھپ گیا ہے، آپ کو دو ایک روز میں ملے گا۔ 'ہمیشہ بہار' کا مقدمہ کمپوز ہو چکا ہے، آخری پروف میرے سامنے رکھے ہیں، آج کل میں پڑھ ڈالوں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۳۔۸۔۶۹ء

مکرمی و محترمی۔ آداب۔

بہت دنوں سے آپ کا خط نہیں آیا، خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ انجمن کی غالب کے متعلق کتابیں بھی ارسال کی

تھیں، ان کی رسید بھی نہیں ملی۔

پیر حسام الدین راشدی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، ان سے آپ کی پریشانیوں کا حال معلوم ہوا۔ آپ کو بھی آرام نہیں ملتا، کوئی نہ کوئی فتنہ گر پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ ان صاحب کو آپ بآسانی درست کر سکتے ہیں، پھر کیا دیر ہے؟

خوش معرکہ کا مقدمہ آپ ہی کے پاس ہے کہ مطبع میں پہنچ گیا، اس مقدمہ کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اسے آپ ٹھیک ٹھاک کر دیں۔

گوہر نوشاہی صاحب نے لکھا تھا کہ وہ اس کا اشاریہ بنا رہے ہیں، انھوں نے بھی کوئی اطلاع نہیں دی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۱۴۔۷۔۶۹ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

گرامی نامہ ملا، بے حد ممنون ہوں۔ اس سے پہلے بھی ایک خط ملا تھا، لیکن اس خط میں آپ نے اپنا پتا نہیں لکھا تھا۔ میں یہی سوچتا رہا کہ خط کس پتے پر لکھوں۔ ''مواد'' کے سلسلے میں عرض ہے کہ میں اصل بھیجوں یا فوٹو۔ یہ بھی لکھیے کہ کیا کیا بھیجوں۔ نیز یہ چیزیں آپ کو کب مل جانی چاہییں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان چیزوں کا استعمال کیا ہوگا، آپ چھپوائیں گے یا محض کسی کو دکھائیں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ ان چیزوں کی عام تشہیر نہ کی جائے، آگے آپ کی مرضی۔ ویسے وہ حضرت آج کل بہت مہربان ہیں۔ میں تو کھلم کھلا آپ کا ہوں، اس لیے وہی کروں گا جس میں آپ کا فائدہ ہو۔ خط آنے پر تعمیل ارشاد کروں گا۔ البتہ یہ گزارش ضرور کروں گا کہ کسی معاملے میں میرا نام نہ آئے۔[۴۹]

والد صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟ مطلع فرمائیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔

'ہمیشہ بہار' کی فہرست، تعلیقات اور غلط نامہ زیر طباعت ہے، آپ کے ارشاد کے مطابق ڈمی کے نشانات کا اصل مسودے سے مقابلہ کرلوں گا۔ کتاب چھپتے ہی، معاملات مابعد پر جلد ہی عمل درآمد ہوگا۔

لاہور آنے کا ارادہ تھا، مگر آج کل مکان تبدیل کرنے کے چکر میں ہوں۔ اگلے مہینے سے ایک دوسرے مکان میں چلا جاؤں گا۔ آج کل اس مکان میں کتابوں کے شیلف وغیرہ بنوا رہا ہوں، اس وجہ سے لاہور آنا مشکل ہے۔ نئے مکان میں اتنی گنجائش

ہے کہ اب آپ کراچی آئیں تو میرے پاس ہی ٹھہریں۔ کتابوں کو مرتب کرنے کے بعد تمام مکرر نسخوں کی فہرست آپ کو بھیج دوں گا، جو کتابیں آپ کے پاس نہ ہوں، وہ آپ کو بھیج دوں گا۔

ریڈیو اسٹیشن سے جن صاحب نے فون کیا تھا، ان کا نام قمر علی عباسی ہے اور ہیں نے پروفوں کے سلسلے میں ان سے کہا تھا کہ آپ سے ملیں، اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔

ادارۂ یادگارِ غالب والے تو تاجر ابن تاجر ہیں۔ میں یہ کتابیں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ایک پیکٹ رجسٹری سے آج ہی روانہ کیا جا رہا ہے۔ ڈار صاحب۵۰ کو ابھی فون کیا تھا، وہ دفتر میں موجود نہیں۔ آج کل میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔ ڈاکٹر ذوالفقار۵۱ کو کتابیں آپ ہی کے گھر کے پتے پر بھیجی جا رہی ہیں۔ یہ پیکٹ انھیں دے دیجیے گا۔ آپ کے تذکرے وغیرہ جو میرے پاس ہیں، ان سے ابھی کام لے رہا ہوں۔ یہ میرے پاس محفوظ ہیں اطمینان رکھیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۲۳۔۹۔۶۹ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

آپ کوئی فون نمبر لکھیے جس پر آپ سے بات ہو سکے۔

﴿۱۸﴾

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

ابھی ابھی گرامی نامہ ملا، ایک مدت کے بعد آپ کی تحریر دیکھی، آنکھوں کو روشنی اور ذہن کو تازگی ملی۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ نے اپنے نیاز مندوں کی فہرست سے میرا نام کاٹ کر سجاد باقر رضوی کا نام لکھ دیا ہے۔ بارے یہ اس خط سے معلوم ہوا کہ میری سابقہ حیثیت قائم ہے۔ گاہے گاہے خط لکھتے رہا کیجیے، اس سے حالات براہِ راست معلوم ہوتے رہتے ہیں، دوسروں کے ذریعے جو حالات معلوم ہوتے (ہیں) اس میں آرائش بیان کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ تجدید محبت کی ہے تو پھر باقاعدہ کیجیے۔ اب آپ اپنی باتوں کا جواب ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ اخبارات میں جو کچھ چھپتا ہے، وہ نظر سے گزرتا رہتا ہے اور اس پر افسوس بھی ہوتا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ بہر حال ہمت نہ ہاریے۔ عبادت صاحب۵۲ مجھ سے نہیں ملے، اور شاید ملنا پسند بھی نہ کریں۔

۲۔ تذکرۂ ہمیشہ بہار کے سلسلے میں سخت نادم ہوں۔ صورتِ احوال یہ ہے کہ انجمن کے مالی حالات خاصے خراب ہیں۔ تذکرے میں چند اجزا کی طباعت کا کام باقی ہے، لیکن روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے کاغذ نہیں خریدا جا سکا۔ توقع ہے کہ کم از کم دو ماہ تک

یہ حالات بہتر ہوں گے اور پھر اس وقت آپ سے حساب کتاب کیا جاسکتا ہے۔ آپ کو یقین رکھنا چاہیے کہ اس میں میری طرف سے کسی کوتاہی کو دخل نہیں ہے۔ جہاں آپ نے اتنے دن انتظار کیا ہے، چند روز اور توقف فرمائیے۔

۳۔ غالب پروفیسری کے سلسلے میں یہاں کوئی تیار نہیں، اور کسی کو تیار بھی نہیں کیا جارہا۔ اگر ایسی کوئی صورت ہوئی تو مطلع کروں گا۔

۴۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں حیدرآباد جارہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب [۵۴] سے گفتگو کروں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔

۵۔ تاریخ ادبیات کا باب میں نے لکھ لیا تھا، نقل اور نظر ثانی کا کام باقی تھا، ۲۳ اگست کو اچانک ملک عبدالرحمٰن کراچی آئے اور باب مجھ سے لے گئے۔ اگر آپ کا خط پہلے مل جاتا تو میں انھیں یہ باب نہ دیتا۔

۶۔ ضروری کاغذات آپ کو اصل صورت میں دے سکتا ہوں، یہ آپ ہی کی امانت ہے، اور اس کے لوٹانے میں مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو آپ سے فون پر کروں گا اور کاغذات بھیج دوں گا۔

۷۔ مجھ سے آپ ۲۳۲۷۸۴ پر بات کر سکتے ہیں۔ دو اور چار کے درمیان آپ کسی دن بھی فون کرلیں، لیکن جمعہ اور اتوار کو نہیں۔ آپ کوئی نمبر بتائیے تو میں فون کرلوں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں، ہم دونوں کی طرف سے بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام۔ والد صاحب قبلہ کی طبیعت کیسی ہے، ان سے بھی سلام کہہ دیجیے۔

'خوش معرکہ زیبا' کی پہلی جلد ابھی تک میرے پاس نہیں پہنچی۔

ڈاکٹر ذوالفقار صاحب [۵۵] سے میرا سلام کہیے۔ ان کے خط کا جواب میں نے اسی دن لکھ دیا تھا۔ حیرت ہے کہ انھیں میرا خط نہیں ملا۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۲۷۔۸۔۷۰ء

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

کل ڈاکٹر نیر کی کتاب [۵۶] رجسٹری سے بھیج چکا ہوں۔ امید ہے مل ہو گی۔ جمیل جالبی صاحب نے ایک مہینے کے لیے عاریتاً دی ہے۔ مطلوبہ خط دو چار دن تک بھیج دوں گا۔ اسے ایسی جگہ رکھا ہے جہاں سے لے کر آنے میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے۔

فون پر بہت سی باتیں ہوئیں، لیکن دو کام کی باتیں رہ گئیں۔ ایک تو یہ کہ نذر غالب میں نے دیکھی تک نہیں۔ یہاں بازار میں بھی نہیں آئی۔ ورنہ آپ کی طرف سے خرید لیتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سال ستمبر میں اردو کا میر انیس نمبر شائع ہوگا۔ اس کے لیے آپ کو ضرور کچھ لکھنا ہے۔ دو تین مہینے کا وقت کافی ہوگا، اس لیے آپ میری مدد ضرور کیجیے۔ غالب نمبر بھی آپ کے تعاون سے نکلا

تھا اور اب بھی آپ کے تعاون کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

قاضی محمد صادق ۵۷ اختر پر میں نے ایک مقالہ لکھا ہے، طوالت میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی اور معیار میں آپ کی تقلید کی ہے۔ اگر یہ آپ کے کام آ سکے تو بھیج دوں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص
مشفق خواجہ
۱۵۔۴۔۷۱ء

بخدمت گرامی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

۱۸ نومبر ۱۹۷۱ء

محترمی و مکرمی۔ آداب

گرامی نامہ ملا، ممنون ہوں۔ مجید لاہوری ۵۸ کی کتابیں ''دور آسمان'' اور ''نمک پارے'' کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ مرحوم کا ارادہ تھا، لیکن نوبت نہ آئی۔ ''جلترنگ''، جنگی پروپیگنڈے سے متعلق نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ کراچی میں کسی کے پاس نہیں، یہاں تک کہ شفیع عقیل کے پاس بھی نہیں، جو مجید لاہوری پر ''اتھارٹی'' ہیں۔ مجید لاہوری کے متعلق میرے پاس تراشے نہیں ہیں۔ ورنہ میں بھیج دیتا۔ شفیع عقیل صاحب سے میں نے گفتگو کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ ''نمکدان'' اور ''جنگ'' کی فائلوں کے سوا اور کوئی چیز دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں آج فون پر بھی بات کرنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا
مشفق خواجہ

بخدمت گرامی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

محترمی و مکرمی۔ آداب

خدا کا شکر ہے کہ ۲۹ نومبر کو انجمن سے رہائی حاصل ہوئی۔ ہمیشہ بہار کا ایک غیر مجلد نسخہ آپ کو چلتے چلتے بھیج دیا تھا۔ اب یہ

کتاب جلد سازی میں ہے۔ اس کے متعلق ایک مفصل نوٹ شبیر علی کاظمی صاحب [59] کو لکھ کر دے آیا ہوں۔ کاظمی صاحب کا تقرر میری جگہ ہوا ہے۔ آیندہ کے لیے انجمن کے متعلق آپ انھی سے خط و کتابت کریں۔ یہ نہایت اچھے آدمی ہیں اور میرے خاص دوستوں میں ہیں۔ ان کا تقرر میں نے ہی کرایا ہے۔ کیوں کہ صدر انجمن نے کہا تھا کہ میں اپنی جگہ کے لیے انھیں کوئی موزوں آدمی دے کر جاؤں۔ حق تصنیف کے نسخوں اور معاوضے کے بارے میں کاظمی صاحب آپ کو لکھیں گے۔

"صحیفہ" کے لیے میرا نیا پتا نوٹ کر لیجیے۔ آیندہ تمام مراسلت بھی اسی پتے پر کیجیے گا۔

میرے ایک دوست ظفیر الحسن صاحب [60] لاہور گئے تھے۔ میں نے آپ کے نام انھیں ایک خط دیا تھا۔ امید ہے ملے ہوں گے۔ اگر یہ لاہور میں ہوں تو ان سے کہیے گا کہ 'خوش معرکہ زیبا' کی دونوں جلدوں کے تین تین سیٹ خریدتے لائیں۔ انھیں وہ رعایت دلوا دیجیے گا جو مجلس مصنفین یا مرتبین کو دیتی ہے۔ اگر ظفیر صاحب نہ ملیں تو پھر دفتر مجلس میں کسی سے کہہ دیجیے کہ مجھے یہ نسخے رجسٹری سے بل کے ساتھ بھیج دیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
خادم مخلص
مشفق خواجہ
۵۔۱۲۔۳ےء

بخدمت گرامی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

پروفیسر شبیر علی کاظمی صاحب اردو انجمنوں کے مشترکہ اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور آ رہے ہیں۔ کوئی لاہور جائے اور آپ سے نہ ملے، ویسی ہی بات ہے کہ آگرے جا کر تاج محل نہ دیکھے۔ سو یہ آپ سے ملنے کے شائق ہیں، اور چونکہ میرے خاص الخاص دوستوں میں سے ہیں، اس لیے ان کے ذریعے گویا میں خود حاضر ہو رہا ہوں۔ کاظمی صاحب سے مل کر آپ خوش ہوں گے۔ مسیحا و خضر کی ملاقات سے زیادہ مزہ آئے گا۔ اس موقع پر میں حسب معمول کچھ فائدے اٹھانا چاہتا ہوں:

۱۔ مجھے "خلاصۃ الافکار" والے ابوطالب خاں اصفہانی کے سفرنامے (سیر طالبی) کی ضرورت ہے۔ اصل فارسی ہو یا اردو ترجمہ (از محزوں مراد آبادی) یا انگریزی ترجمہ (لندن ۱۸۱۴ء)۔ ان میں سے جو بھی آپ کے ذاتی کتب خانے میں ہو، کاظمی صاحب کو دے دیجیے۔ ایک مہینے بعد واپس کر دوں گا۔

۲۔ خواجہ محمد زکریا صاحب نے ان سائی کلو پیڈیا آف اسلام (اردو) کی ابتدائی نو جلدیں نصف قیمت پر دلوا دی تھیں۔ سنا ہے

اب دسویں اور گیارھویں بھی چھپ گئی ہیں، ان کا ایک ایک نسخہ خریدنا چاہتا ہوں۔ کاظمی صاحب کو دلوا دیجیے اور قیمت بھی بھی ادا کر دیں گے۔ (سبز رنگ کی جلدیں درکار ہیں)

صحیفہ کی ڈمی ملی۔ ناشر کی حیثیت سے آپ کا نام شائع ہوا ہے۔ کیا اس کا امکان ہے کہ اب یہ رسالہ اپنی اصل صورت میں شائع ہو۔ پاکستان میں ایک ہی علمی و تحقیقی رسالہ تھا، اسے بھی بے علموں اور بے تحقیقوں کی نظر کھا گئی۔

میر حسن کی 'سحر البیان' کے کئی نسخوں کا سراغ ملا ہے۔ ان میں کئی مصور ہیں، اور بعض دیگر خصوصیات کی بنا پر اہم۔ شاید یہ اطلاع آپ کے کراچی آنے کا سبب بن جائے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۲۴۔۱۔۷۴ء

۲۹/۱۱/۷۴ء

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

شبیر علی کاظمی صاحب کے ہاتھ جو خط میں نے بھیجا تھا، اس کے جواب کا انتظار ہے۔ ممکن ہے آپ نے کاظمی صاحب کو جواب سے مطلع کر دیا ہو، لیکن وہ غیر حاضر دماغ آدمی ہیں۔ انھوں نے ''سیر طالبی'' کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اس کتاب کی مجھے شدید ضرورت ہے۔ اگر آپ کے ذریعے مل جائے تو کرم ہوگا۔

مثنوی میر حسن کے اب تک تین مصور نسخے دریافت ہو چکے ہیں۔ ایک دلچسپ نسخہ حیدر آباد دکن کے کسی نواب کا لکھوایا ہوا بھی ملا ہے۔ نواب صاحب نے کاتب کو حکم دیا کہ جہاں جہاں خلا محسوس ہو، وہاں شعر اپنی طرف سے بڑھا دو۔ کاتب صاحب نے تقریباً ڈھائی سو شعر اپنی طرف سے اضافہ کر دیے۔

ادھر میں نے بہت سے مضمون لکھ ڈالے ہیں۔ جعفر علی حسرت پر ایک طویل مقالہ ''اردو نامہ'' کے زیر طبع شمارے میں آ رہا ہے[۶۱]۔ نو دریافت تذکرۂ شعرائے فارسی، گلشن مشتاق، پر مقالہ اردو میں شائع ہو رہا ہے۔[۶۲] غالب لائبریری (ادارہ یادگارِ غالب) نے ''غالب'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا ہے۔ پہلا شمارہ جنوری میں شائع ہوگا۔ اس میں، میں نے ''پرانے شاعر نیا کلام'' کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا ہے، جس میں ایسے شعرا کے حالات اور انتخاب کلام ہوگا جن کے دواوین شائع نہیں ہوئے۔ پہلا مضمون جسونت سنگھ پروانہ پر ہے۔ اور بھی کئی مضمون تیار ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ میں نے لکھنا شروع کیا تو رسالے بند ہو گئے۔ تذکرۂ خازن شعراء (.........[۶۳]) کی فوٹو اسٹیٹ میں نے حاصل کر لی ہے۔ یہ عجیب و غریب تذکرہ ہے۔ شعرا کے حالات ایسے مفصل ہیں کہ شاید ہی کسی تذکرہ نگار نے لکھے ہوں۔ بعض شعرا پر بیس بیس صفحات لکھے گئے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی دسویں اور

گیارھویں جلدیں اگر مل گئی ہوں تو میرے برادر بزرگ خواجہ عبدالقیوم صاحب کے حوالے کر دیجیے۔ وہ اگلے مہینے کراچی آئیں گے تو ساتھ لیتے آئیں گے۔ انھیں امروز میں فون کر کے بلوا لیجیے گا، ان کے گھر کا فون نمبر ۶۷۸۰۰ ہے۔ اس زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

یہاں پہنچ کر میں نے ایک خط لکھا تھا جو حسبِ معمول آپ کے نزدیک جواب طلب نہیں تھا، آپ کی مصروفیات کا عالم اپنی آنکھوں دیکھ آیا ہوں، اب تعجب ہوگا تو اس بات پر کہ آپ جواب لکھ دیں۔

چند روز ہوئے پیر صاحب [65] سے ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے، آپ سے اپنی خاص ملاقات کی تفصیل سنائی۔ پیر صاحب آپ سے کچھ کھنچے کھنچے سے ہیں، خدا جانے ایسا کیوں ہے۔ آخر آپ پیروں کو ناراض ہونے کا موقع کیوں دیتے ہیں۔ بہر حال میں نے اپنے طور پر موصوف کو راہ پر لانے کی کوشش کی ہے۔

مالک رام [66] نے مجھے کچھ آف پرنٹس بھیجے تھے۔ (آپ کے لیے نصیر احمد ناصر [67] کے لیے اور بعض دوسرے لوگوں کے لیے) یہ سب میں آپ کو دے آیا ہوں۔ مالک رام صاحب کا خط آیا کہ نصیر احمد ناصر صاحب کو یہ نہیں ملے۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو بھی نہیں ملے ہوں گے۔ آپ ہی کے پاس پڑے ہوں گے۔ ازرہ کرم اپنے چپڑاسی کے ذریعے انھیں تقسیم کرا دیجیے۔ مالک رام صاحب نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ آپ نے ان کے متعدد خطوں کا جواب نہیں دیا۔ میں نے انھیں لکھ دیا ہے کہ ''ڈاکٹر صاحب کے نام آپ کے خط میری موجودگی میں موصول ہوئے تھے، لیکن جواب ڈاکٹر صاحب نے میرے سامنے نہیں لکھا کیوں کہ میں لاہور میں سال دو سال ٹھہرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آیندہ سال لاہور جاؤں گا تو اپنے سامنے جواب لکھوا دوں گا۔'' مالک رام صاحب نے آپ سے 'نگار' کا مطبوعہ کلام شائع کردہ درگا پرشاد [68] طلب کیا تھا۔ یہ میں نے بھیج دیا ہے، آپ زحمت نہ فرمائیں۔

اپریل کے پہلے ہفتے میں، ایک دن اچانک ایک صاحب کا فون آیا، آواز بالکل غیر مانوس تھی۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ہیں، دمشق جا رہے ہیں اور کراچی ایئرپورٹ پر ''مقید'' ہیں۔ میں فوراً ایئرپورٹ پر پہنچا۔ کوئی آٹھ دس گھنٹے کی ملاقات رہی۔ انھیں شہر آنے کی اجازت نہیں ملی تھی، اس لیے ایئرپورٹ کے ایک ہوٹل میں ہم بیٹھے رہے۔ آپ کا ذکر بڑی محبت سے کرتے رہے۔ انھیں آپ سے ملنے کی بڑی آرزو ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین [69] صاحب کا حال بھی پوچھتے رہے۔ آپ دونوں کو انھوں نے سلام کہا ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آپ کی طرح باغ و بہار ہیں، ان میں قاضی عبدالودود والی محققانہ کرختگی اور بوسیدگی نہیں ہے۔

دو چھوٹے چھوٹے کام۔

۱۔ کیا پنجاب یونی ورسٹی میں کسی نے منثو[۱] پر مقالہ لکھا ہے؟

۲۔ ڈاکٹر غلام حسین صاحب سے پوچھ لیجیے کہ انھوں نے مولانا امتیاز علی عرشی صاحب کو ''دیوان زادہ'' بھیج دیا ہے۔ ان کا خط آیا تھا وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر کتاب کو رامپور پوسٹ کرنے میں کوئی دقت ہو تو ذیل کے پتے پر پہنچا دیں۔ یہ صاحب رامپور آتے جاتے رہتے ہیں اور شاید عرشی صاحب کے عزیز ہیں۔

اشتیاق محمد خاں صاحب

۲۳۔ کینال پارک، گلبرگ، لاہور

ہم دونوں کی طرف سے والد صاحب، والدہ صاحبہ اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب، بچی کو پیار۔ آمنہ پوچھ رہی ہیں کہ آپ بیگم صاحبہ اور بچی کے ساتھ کراچی کب آ رہے ہیں۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۸۔۶۔۷۶

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

﴿۲۵﴾

حضرت من۔ سلام مسنون۔

محترم شبیر حسین[۲] آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ سبب یہ خود بتائیں گے۔ ان کی مدد کیجیے۔ ان کا کام میرا کام ہے۔

مالک رام صاحب نے دو کتابیں بھیجی ہیں۔ چار میری طرف سے قبول فرمائیے۔ عنقریب اور بھی بھیجوں گا۔ ہندوستان سے اکثر لوگوں کے خط آتے ہیں، اور وہ سب شاکی ہیں کہ آپ خط کا جواب نہیں لکھتے۔ ابھی کل ہی اکبر حیدری کا خط آیا ہے۔

مجھے 'تذکرۂ بے جگر' اور 'تذکرۂ شاہ کمال' کی چند روز کے لیے ضرورت آ پڑی ہے، جلد ہی واپس کر دوں گا۔ آپ سے جو کتابیں لاہور سے لایا تھا، وہ بھی جلد واپس کر دوں گا۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور تاریخ ادب کی بعض جلدیں شبیر صاحب میرے لیے خریدیں گے۔ انھیں حسب معمول نصف کی رعایت دلوا دیجیے۔ شبیر صاحب کو خواجہ زکریا صاحب کے حوالے نہ کیجیے گا، ورنہ اس غریب مسافر کی عاقبت خراب ہوگی۔ خواجہ صاحب ایک دن مجھے آئیڈیل بک ڈپو پر بٹھا کر کہنے لگے ''آپ بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں۔ اس کے بعد وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔

ملاقات ہو تو میرا اسلام کہیے گا، اور یہ بھی کہ حضرت میں اب کراچی میں ہوں۔ آپ اب آئیڈیل بک جا سکتے ہیں۔

محترم ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب اکثر یاد آتے ہیں۔ ان سے بھی میرا اسلام کہیے گا۔

امید ہے آپ کے کمرے کی محفلیں حسب معمول گرم ہوں گی۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۵۔۱۔۷۷ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

﴿۲۶﴾

محترمی ومکرمی۔ سلام مسنون۔

گرامی نامہ مل گیا تھا، لیکن پریشانیوں کی وجہ سے جواب نہ دے سکا۔ آمنہ اس مہینے کے شروع میں اسپتال سے آ گئی تھیں۔ آپریشن کامیاب رہا۔ لیکن حادثہ یہ ہوا کہ گھر آنے کے چند روز بعد ان کے ایک جوان بھائی کا انتقال ہو گیا۔ ایسی حالت میں بیماری کا خیال رہا نہ آپریشن کا۔ بیچاری ہر وقت روتی رہتی ہے۔ بہر حال زخم مندمل ہو رہے ہیں۔

جالبی صاحب کے ذریعے دونوں تذکرے مل گئے۔ شکریہ۔

نیشنل میوزیم جانا نہیں ہوا۔ ان شاء اللہ اگلے مہینے سے وہاں جانا شروع کروں گا، اور پہلا کام آپ ہی کا کروں گا۔

آپ کو جن کتابوں کی ضرورت ہے، ان کی فہرست بھیج دیجیے۔ آپ نے پنجاب یونی ورسٹی کی مطبوعات کی فہرست ارسال نہیں کی۔ توجہ فرمائیے۔

اب کے کراچی میں آپ کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار سکا۔ اس کا مجھے بے حد افسوس ہے، لیکن میری مجبوری آپ کے سامنے ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ بھابھی کی خدمت میں آداب، بچی کو پیار۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۸۔۳۔۷۷

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، لاہور

﴿۲۷﴾

محترمی و مکرمی۔ آداب۔

حسب معمول پھر زحمت دینے کے لیے حاضر ہو رہا ہوں۔ والد صاحب قبلہ، علامہ اقبال سے متعلق اپنی یادداشتیں مرتب کر رہے ہیں [۲]۔ اس سلسلے میں "ملفوظاتِ اقبال" مرتبہ محمود نظامی کی فوری طور پر ضرورت ہے۔ میرے پاس اس کے دونوں ایڈیشن تھے، لیکن خدا جانے کہاں غائب ہو گئے۔ آپ یہ کیجیے کہ اس میں والد صاحب کا جو مضمون ہے، اس کی نقل یا فوٹو اسٹیٹ بھجوا دیجیے۔ پوری کتاب کی ضرورت نہیں۔ اگر فوٹو بنوانے کی فرصت نہ ہو پھر کتاب ہی رجسٹری سے بھیج دیجیے۔

آج کل ڈاکٹر محمد حسن صاحب [۳] آئے ہوئے ہیں، ان سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ آپ کے بڑے مداح ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اپنے "استاد بھائی" [۴] سے مل کر بھی مداح رہتے ہیں یا نہیں۔۔ ویسے میں نے انھیں پوری صورت حال سمجھا دی ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور خواجہ زکریا صاحب کی خدمت میں سلام۔ آمنہ ابھی پوری طرح صحت یاب تو نہیں ہوئیں، لیکن پہلے سے، بہت بہتر ہیں۔ وہ آپ کو اور بھابھی کو سلام لکھواتی ہیں۔

بچی کو ہم دونوں کی طرف سے پیار۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۲۔۷۔۷۷

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

﴿۲۸﴾

محترمی و مکرمی۔ آداب

نظیر صدیقی صاحب [۵] کے بارے میں آپ سے فون پر جو گفتگو ہوئی تھی، وہ آپ کو یاد ہوگی۔ اب ملتان یونیورسٹی میں انٹرویو ہونے والا ہے، آپ یا ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب وہاں جائیں تو نظیر صاحب کا خیال رکھیں۔

ہم دونوں کی طرف سے بھابھی صاحبہ کی خدمت میں آداب، بچی کو پیار۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ

۲۷۔۹۔۷۷ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

میرے محترم۔ سلام مسنون۔

فون پر تو ہر دوسرے دن بات ہوتی ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری باتوں میں کوئی اثر نہیں رہا۔ حالاں کہ بعض ''ماہ جبین'' اب بھی میری باتوں میں آ جاتے ہیں۔ عرض یہ ہے کہ ''اردو تنقید کے دس برس'' کے موضوع پر آپ کو لکھنا ہے ورنہ لوگ کہیں گے مشفق خواجہ کے رسالے میں ڈاکٹر وحید قریشی کے کسی مضمون کا نہ ہونا ایسا ہی تعجب خیز ہے جیسے احمد ندیم قاسمی کے رسالے میں پروین شاکر کی کوئی چیز نہ ہو۔ تشبیہ ناقص سہی، لیکن اپنا مفہوم واضح کرنے کے لیے فی الوقت بوجہ مصروفیت یہی تشبیہ ہاتھ آ سکی ہے اور اسی کو قبول فرمائیے۔

۶۹ء میں غالبیات پر جو کام ہوا ہے، اسے چھوڑ دیجیے۔ ۷۰ء میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، انھیں سامنے رکھ لیجیے۔ فنون [۷۶] اوراق [۷۷] اور افکار [۷۸] کے پرچوں کو بھی دیکھ لیجیے۔ کراچی سے اس دوران میں جو کتابیں چھپی ہیں، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

۱۔ ''ادھوری جدیدت''۔ سلیم احمد [۷۹]

۲۔ ''نیم رخ''۔ مجتبیٰ حسین [۸۰]

۳۔ ''۲+۲=۵''۔ شمیم احمد [۸۱]

۴۔ ''قصہ نئی شاعری کا''۔ احمد ہمدانی [۸۲]

۵۔ ''نظرات''۔ وقار رضوی [۸۳]

ان میں سے جو کتابیں آپ کے پاس نہ ہوں، میں بھیج دوں گا۔ اس مضمون میں صرف تنقید پر بحث ہوگی، ''تحقیق'' کا ذکر نہیں آئے گا۔ اس طرح آپ کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ ایک دو پیراگراف اقبال پر تنقید سے متعلق بھی لکھ دیجیے گا، جیسے وزیر آغا اور سلیم احمد کی کتابیں۔ اس مقالے میں مفصل ذکر محمد حسن عسکری [۸۴]، ڈاکٹر سید عبداللہ [۸۵]، سلیم احمد، وزیر آغا، فتح محمد ملک کا کر دیجیے اور باقی سب کو ایک ایک دو سطروں میں بھگتا دیجیے۔ اس طرح پندرہ بیس صفحوں کا مضمون ہو جائے گا۔ اس ماہ کی ۳۱ تاریخ تک یہ مضمون ہر حالت میں مکمل کر دیجیے۔ اسے مدیرانہ فرمائش نہیں، دوستانہ گزارش اور نیازمندانہ استدعا سمجھیے۔ اب اس سلسلے میں آپ کی مصروفیات کا کوئی بھی عذر نہیں سنوں گا۔ مصروفیات اس وقت حائل ہوتی ہیں جب کوئی کام نہ کرنا ہو۔ اور یہ کام تو آپ کو ہر حالت میں کرنا ہے۔

آج کے مشرق میں تیسری جنس کے نمائندہ ادیب نے اپنے کالم میں پھر آپ کی طرف کچھ نازیبا اشارے کیے ہیں۔ میر

جملہ ۸۶ سے کہیں کہ ذرا اس نا ہنجار کی اچھی طرح خبر لیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

بھابھی صاحبہ کی خدمت میں ہم دونوں کا آداب بچی کو پیار۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۸۔۵۔۸۰ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

حضرت من۔ آداب۔

فون پر آج گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ مضمون لکھنا تو کیا ابھی آپ نے اس کا ارادہ بھی نہیں کیا۔ یقین کیجیے سارا دن تشویش رہی اور اب یہ خطرات کے ایک بجے لکھ کر بوجھ ہلکا کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں یہ رسالہ با قاعدہ منصوبہ بنا کر نکال رہا ہوں۔ ''اردو ادب کے دس سال'' کے عنوان کے تحت بارہ مضامین ہوں گے جو مختلف اصناف ادب کے جائزوں پر مشتمل ہیں۔ گیارہ مضامین موصول ہو چکے ہیں۔ بارھواں آپ کے ذمے ہے، ''اردو تنقید کے دس سال'' اس مضمون کے بغیر سلسلہ مکمل نہیں ہوگا۔ اگر آپ شروع ہی میں انکار کر دیتے تو میں کسی اور کو اس کام پر لگا دیتا۔ اب یہ مضمون آپ ہی کو لکھنا ہے۔ از رہِ کرم دو چار دن کے لیے مجلس آرائیوں کو ختم کر کے ''خانہ نشین'' ہو جایئے اور یہ مضمون لکھ ڈالیے۔ آخر آپ جلسے جلوسوں اور ریڈیو وغیرہ کے لیے وقت نکالتے ہی ہیں، اس کام کے لیے بھی وقت نکالیے۔ اگر اس مہینے کی ۲ تاریخ تک یہ مضمون نہ آیا تو میں سمجھ لوں گا کہ آپ مجھے اس طرح ٹال رہے ہیں جیسے مرزا ادیب کو ٹالتے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۹۔۷۔۸۰ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

میرے محترم۔ آداب۔

بس آخری بار بتا دیجیے کہ میں مایوس ہو جاؤں۔ آپ کی وجہ سے رسالے کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ لیکن اب طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۱۰۔۸۔۸۰ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

حضرت من۔ آداب۔

گزشتہ روز فون پر آپ نے "مژدۂ مایوسی" سنا کر جس طرح شاد کام فرمایا، اس کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کروں۔ گزشتہ ایک برس میں مواد جمع کرنے، مضمون کا آغاز کرنے، جلد ہی ختم کرنے کی جو خوش خبریاں وقتاً فوقتاً سنائی تھیں، ان سے امید بندھی تھی کہ آپ دیر سویر مضمون لکھ ہی دیں گے۔ رسالے کا کام میں گزشتہ ماہ کے شروع میں ختم کر چکا تھا، اب محض آپ کے مقالے کا انتظار تھا، اور وہ بھی اس لیے کہ یہ ایک خاص سلسلے کا مضمون تھا۔ اگر آپ شروع ہی میں مایوس کر دیتے تو میں کسی اور سے لکھوا لیتا۔ آخر نظم، غزل، افسانے، ناول وغیرہ پر میں نے دوسروں سے مضمون لکھوائے ہی تھے۔ تنقید پر بھی کوئی اللہ کا بندہ ہاتھ صاف کر دیتا۔ اس ایک سال میں آپ نے ٹی وی اور ریڈیو کے بیسیوں پروگراموں میں حصہ لیا۔ محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام تقریریں کیں (محکمہ زکوٰۃ کے زیر اہتمام بھی کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہوگا)۔ اگر آپ میری فرمائش کی تکمیل کے لیے صرف ایک روز نکال لیتے تو آج مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ کوئی اور ہوتا تو میں اس سے زندگی بھر کے لیے ناراض ہو جاتا، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ آپ سے ناراض ہونا بھی اپنے بس کی بات نہیں۔ مجھے یہ اعتماد تھا کہ ڈاکٹر وحید قریشی میری کوئی فرمائش نہیں ٹال سکتے۔ اب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے مشفق خواجہ کو بھی کوئی عام قسم کا ایڈیٹر سمجھا۔ معلوم ہوتا تو میں ایڈیٹری کا روگ ہی نہ پالتا، کم از کم اعتماد کا خوبصورت تصور تو اپنی جگہ قائم رہتا۔

خیر جو ہوا سو ہوا۔ آگے کو ہوئے اب کان ہمیں۔ میں نے تحسین فراقی صاحب کو لکھا ہے۔ وہ دو ایک روز میں آپ سے ملیں گے۔ آپ ازرہِ کرم اتنا کیجیے کہ انور سدید صاحب کے بھیجے ہوئے کاغذات تحسین صاحب کے حوالے کر دیجیے۔ اگر انھیں کچھ کتابوں کی ضرورت ہو تو وہ بھی عاریتاً عنایت کر دیجیے۔

آپ کی ایک شاگرد جو جسونت سنگھ پروانہ پر کام کر رہی ہیں (نام بھول گیا ہوں) ان کے بھائی میرے پاس آئے تھے اور مجھ سے کلیات پروانہ، نسخہ کلکتہ (ایشیاٹک سوسائٹی) کی مائیکروفلم لے گئے تھے۔ ان سے فرما دیجیے کہ فلم سے فوٹو بنوانے کے بعد وہ مائیکروفلم آپ کو دے دیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ ہم دونوں کی طرف سے بھابھی کی خدمت میں آداب۔ بچی کو پیار۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۶۔۷۔۸۰ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور
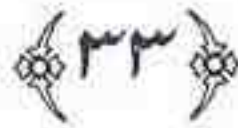
حضرت من۔ آداب۔

بہت دنوں سے آپ کا فون نہیں آیا۔ آپ کے فون کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ نہ آئے تو پریشانی ہوتی ہے۔ میں نے بھی بہت دنوں سے کوئی خط نہیں لکھا۔ وجہ یہ کہ آپ میرے خطوں کی کثرت سے گھبرانے لگے ہیں، حالاں کہ میرے خط مضمون کے اعتبار سے وحدت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہی چند فرمائشیں دہراتا رہتا ہوں جو کئی سال پہلے سے اپنی تکمیل کے لیے بے تاب ہیں۔ مجھے آرزو اور حسرت (شاعر نہیں الفاظ) کا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ اب معلوم ہوا کہ میری فرمایش جب مجھ سے روانہ ہوتی ہے تو وہ میری آرزو ہوتی ہے۔ جب آپ کے پاس پہنچ جاتی ہے تو میری حسرت بن جاتی ہے۔ قبلہ! میرے پچھلے خط جو آپ نے بقول خود مجموعہ تیار کرنے کے لیے اکٹھے کر رکھے ہیں۔ ایک مرتبہ انھیں پڑھ ڈالیے۔ جو جو کام میں نے لکھے ہیں، ان پر ممکن اور ناممکن کے نشان لگا دیجیے اور پھر جو ممکن ہوں انھیں انجام دے ڈالیے۔ (اور اگر اب تک خطوں کے لفافے کھولے ہی نہ ہوں تو اب زحمت فرمایئے)

اسلام آباد والی رضیہ بیگم پی ایچ ڈی کے لیے بے قرار ہیں۔ یہ ڈاکٹر تنویر علوی کی بھتیجی ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ آپ کو معلوم ہے تنویر علوی صاحب سے میرے گہرے مراسم ہیں، اس لیے جہاں تک ہو سکے اس عزیزہ کا خیال رکھیے۔ یہ میری درخواست ہے۔

آپ نے جو افسانہ بھیجا ہے وہ واپس ارسال ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۲۔۷۔۸۱ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور
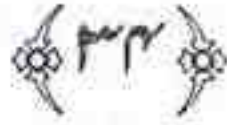
میرے محترم۔ سلام مسنون۔

قیوم نظر صاحب[۸۷] کراچی آئے تھے تو انھوں نے فرمایا تھا کہ ان کے پاس لطافت (ابن امانت لکھنوی) کا دیوان ہے۔ مجھے اس کی شدید ضرورت ہے۔ آپ اگر ان سے رابطہ قائم کرسکیں تو کرم ہوگا۔ آپ روزانہ آئیڈیل بک ڈپو کے سامنے سے گزرتے ہیں انھیں یاد دلاتے رہیے۔ اور سید امجد الطاف صاحب سے بھی کہیے کہ کسی طرح قیوم نظر صاحب کے ہاں سے اسے تلاش کرلیں۔ قیوم نظر صاحب کے لیے اپنی کتابوں میں سے کسی خاص کتاب کو تلاش کرنا مشکل ہے۔

اعجاز رحمانی صاحب[۸۸] کو میں نے اپنی کتابیں بھیجی تھیں، خط لکھا تھا، 'دیوان عیش' کا فوٹو اسٹیٹ فراہم کرنے کا انھوں نے از خود وعدہ کیا تھا۔ رحمانی صاحب نے کتابوں کی رسید بھیجی، نہ میرے خط کا جواب لکھا۔

عالی صاحب[۸۹] پر آپ مضمون اب لکھ ہی ڈالیے۔ کیا میں زندگی بھر آپ کے وعدوں کے حصار میں رہوں گا؟ کبھی تو ایفائے وعدہ کا کوئی موقع آنے دیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۹۔۹۔۸۲ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

﴿۳۵﴾
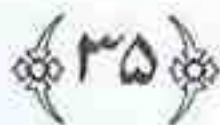
حضرت من۔ کل فون پر آپ سے بات ہوئی تو آپ نے حسب مزاج خود بندے کو مژدۂ تکمیل مضمون سنایا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے دولت خانے کی چار دیواری سے باہر میں ہی ایک نیاز مند رہ گیا ہوں جو اب بھی آپ کے وعدوں کا یقین کرتا ہے۔ اب سوائے اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ اگر ایک ہفتے تک آپ کا مضمون نہ آیا تو میں عبادت بریلوی کا ایک مطبوعہ مضمون (جو عالی

کی شاعری پر ہے) آپ کے نام سے شائع کر دوں گا۔ نتائج کی ذمہ داری آپ پر اور عبادت بریلوی پر ہوگی یا پھر عالی صاحب نتیجہ بھگتیں گے۔ میں ہر ایک سے کہہ چکا ہوں کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے مضمون لکھ کر مجھے بھیج دیا ہے۔ اب اس بڑھاپے میں جھوٹا بننا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

توجہ فرمائیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۲۔۱۲۔۸۲ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

﴿۳۶﴾
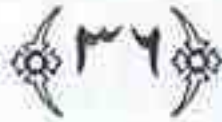
حضرت من۔ سلام مسنون۔

آج کل علی جواد زیدی [۹۰] یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ۱۴ کو لاہور جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاں ٹھہریں گے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کے بڑے قدر دان ہیں اور ملنے کے مشتاق۔ ملنے کے لیے آئیں گے۔ آپ ان سے عبادت بریلوی کا مہمان سمجھ کر نہ ملیے گا۔ اپنے کالج میں اور اکیڈمی میں بھی مدعو کیجیے گا اور ہو سکے تو دونوں اداروں کی مطبوعات تحفۃً بھی دیجیے گا۔ یہ لاہور پہنچتے ہی آپ سے رابطہ کریں گے۔

سنا ہے آپ 'نگار' [۹۱] کے سلسلے میں کراچی تشریف لا رہے ہیں۔ اس مرتبہ آپ کو غریب خانے پر ہی قیام کرنا ہوگا۔ میں نے فرمان صاحب سے کہہ دیا کہ وہ آپ کا انتظام کہیں اور نہ کریں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۹۔۱۔۸۳ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

۳۷

حضرت من۔ آداب۔

آپ ہوا کے جھونکے کی طرح آئے اور چلے گئے۔ آپ کے جانے کے بعد کلبۂ احزاں بے رونق ہو جاتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر حیدری کشمیری کی کتاب منگوا لیجیے۔

۲۔ مصنفین کے حالات کا عکس بھیج دیجیے۔

۳۔ اپنے ذاتی کتب خانے کی فہرست بھیج دیجیے۔

۴۔ خدا بخش تنویر کے دیوان کے دیباچے کا عکس منسلک ہے۔ اسے پڑھ کر تصحیح فرما دیجیے۔

۵۔ شہزاد منظر ۹۲ کے لیے اکادمی آف لیٹرز کے وظیفے کی بات آگے بڑھنی چاہیے۔

۶۔ ہندوستان جانے کے لیے میں نے NOC مانگا تھا، اس کا کیا ہوا۔

۷۔ علامہ اقبال کی تصویر کا عکس منسلک ہے۔ اس کے پیچھے سائز اور مصوروں کا نام لکھ دیا ہے۔ یہ تصویر سلمان صدیقی کی ملکیت ہے۔ قیمت پانچ ہزار روپے ہے۔ نہایت اعلیٰ درجے کی تصویر ہے۔ اس کو نکلوا دیجیے۔

ان تمام امور کے سلسلے میں آپ کے اس خط کا انتظار کروں گا، جو مجھے معلوم ہے کہ آپ لکھیں گے نہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۶۔۸۔۸۴ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

۳۸

حضرت من۔ سلام مسنون۔

ہفتہ بھر پہلے آپ نے شام کو دوبارہ فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں آپ کے فون کے انتظار میں ہوں۔ صورت حال یہ ہے کہ نیپا کا آڈیٹوریم ۱۲ جولائی کے لیے بک کرا لیا گیا ہے۔ وہاں ۱۵۰۰ روپے دینے ہیں، کرایے کے۔ یہ بکنگ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے ذریعے ہونا ہے۔ نیپا کے نام ۱۵۰۰ روپے کا چیک بھجوا دیجیے۔ جلسے میں جانے کا انتظام نیپا والے نہیں کریں گے۔ جلسے کے منتظمین کو کرنا ہوگا۔ کارڈ بھی چھپوانے ہوں گے۔ ان سب معاملات کے لیے ایک معقول رقم ادارہ یادگار غالب کو بھجوا دیجیے۔ اگر نیپا کو جلد ادائی

نہ کی گئی تو بکنگ منسوخ ہو سکتی ہے۔

جلسے کے لیے آپ کس کس کو بلا رہے ہیں۔ان کے ناموں سے مطلع کیجیے تا کہ کارڈ چھپوائے جا سکیں۔

میں نے نورالحسن جعفری ۹۳ سے کہا ہے کہ وہ ۱۳ جولائی کی صبح کو اردو ڈکشنری بورڈ کی میٹنگ رکھوا دیں تا کہ آپ شرکت کر سکیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۳-۶-۸۶ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

﴿۳۹﴾

محترمی و مکرمی۔سلام مسنون۔

آپ نے جن کتابوں پر نشان لگائے تھے، وہ آج ہی روانہ کی جا رہی ہیں۔یعنی مکتبۂ اسلوب کی وہ کتابیں جو آپ کے پاس نہیں ہیں۔

میں نے یہاں آ کر بزم اقبال کی فہرست دیکھی تو اس میں کئی کتابیں ایسی نظر آئیں جو میرے پاس نہیں ہیں۔اقبال کے بعض شمارے بھی نہیں ہیں۔نشان شدہ فہرست کی کتابیں اگر بآسانی مل سکتی ہوں تو بھیج دیجیے۔مطلوب رسالوں کی فہرست بھی منسلک ہے۔

اب کے لاہور کا قیام بے حد مختصر تھا۔بہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ آپ کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزرا، لیکن اتنا نہیں جتنا دل چاہتا تھا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۵-۹-۸۸ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، لاہور

حضرت من۔ آداب۔

اس دن آپ کے لہجے کی خفگی مجھے اچھی لگی۔ عشق صادق ہوتو دوسری جانب سے جو کچھ ہووہ اچھا ہی لگتا ہے، لیکن ایسی بھی کیا خفگی کہ آپ نے فون کرنا ہی بند کر دیا۔ آج چوتھا دن ہے، میں فون کے انتظار میں ہوں۔ ایسی بھی کیا خفگی!

اصل قصہ یہ ہے کہ میں نے اکبرعلی خان کو بہت پہلے چند خطوں کے عکس بھیجے تھے۔ آپ کو جب یہ خط دیے تو میں بھول چکا تھا کہ کچھ خط اکبرعلی خاں کو بھیج چکا ہوں۔ آٹھ سال پہلے میں نے ازخود یہ خط آپ کو دیے تھے کہ ایڈٹ کر دیجیے۔ اگر مجھے یاد ہوتا کہ کچھ خط اکبرعلی خاں کو بھیج چکا ہوں تو آپ سے کیوں چھپاتا؟ بس اتنی سی بات ہے۔ اس سے زیادہ نہ کم۔ آپ نے فرمایا تھا، اور آپ کے کہنے پر محمد طفیل مرحوم نے مجھے لکھا تھا کہ ''نقوش'' کے لیے انھیں مرتب کردوں۔ مگر میں نے آپ سے بھی اور ان سے بھی عرض کیا تھا کہ میں اس کا اہل نہیں۔ یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ آٹھ برس تک آپ کے مرتبہ خط شائع نہ ہوئے۔ اب اکبرعلی خاں نے ان میں سے بعض چھپوا دیے۔

اس وضاحت کے بعد بھی اگر آپ ناراض ہیں تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی۔ ناراضی کے لیے چار دن بہت ہوتے ہیں۔ اب غصہ تھوک دیجیے اور مجھ سے پہلے جیسے خوبصورت اور دل آویز لہجے میں گفتگو کیجیے کہ آپ کا فون وصول کرنا میری عادات میں شامل ہو چکا ہے اور آپ یہ جانتے ہیں کہ میری عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ چلیے خفگی کے لہجے ہی میں فون کیجیے۔ اور خفگی کے عالم میں دونوں اداروں کی نئی کتابیں پوسٹ کر دیجیے۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۲۔۳۔۸۹ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون۔

ایک خط رجسٹری سے بھیجا ہے۔ امید ہے ملا ہوگا۔

یہ خط ایک ضروری کام میں لکھ رہا ہوں۔ حیدرآباد دکن کے افسانہ نگار اور ڈراما نویس غلام جیلانی صاحب سے آپ واقف ہوں گے۔ یہ غلام ربانی مرحوم کے بیٹے ہیں جو مولوی عبدالحق کے قریبی لوگوں میں تھے اور آثار قدیمہ وغیرہ پر مضامین لکھتے تھے۔

''انجمن ترقی اردو کی کہانی'' بھی ان کی تصنیف ہے۔ غلام جیلانی صاحب سے میں نے حیدرآباد دکن کے کچھ مخطوطات کے عکس منگوائے ہیں۔ وہ یہ عکس لے کر لاہور پہنچ چکے ہیں۔ وہ کراچی آئیں گے لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ نہ آسکیں۔ ایسی صورت میں، میں نے انھیں خط لکھا ہے کہ وہ آپ سے رابطہ قائم کریں۔ مخطوطات کے عکس ان سے لے لیجیے اور جو رقم وہ طلب کریں انھیں دے دیجیے (دو سوا دو ہزار روپے کے قریب)۔ مجھے فون پر بتا دیجیے اور میں فوراً اس رقم کا ڈرافٹ آپ کو بھیج دوں گا۔ آپ کو زحمت تو ہوگی، لیکن اور کون ہے جسے زحمت دوں۔

غلام جیلانی صاحب آپ کے پاس آئیں تو مجھ سے بات کرا دیجیے گا۔

ان مخطوطات کے لیے میں گزشتہ بیس برس سے کوشاں تھا۔ بے حد خوش ہوں کہ یہ کام ہو گیا۔ ان کے نام آپ بھی سن لیجیے۔ (۱) تذکرۂ یادگارِ ضیغم کا وہ قلمی نسخہ جس میں مصنف نے بے شمار ترمیمیں اور اضافے کیے ہیں۔ (۲) تذکرہ یاران زماں۔ احمد علی رسا۔ ہم عصر شعرا و علما کے حالات۔ (۳) تاریخ اقتداریہ۔ لکھنؤ کی تاریخ۔ پہلی اور تیسری بہت ضخیم کتابیں ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۸۹-۴-۲۶ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

حضرت من۔ سلام مسنون۔

آپ نے فون کرنا کم کر دیا۔ میرا کیا ہوگا۔ علم حاصل کرنے کا یہی تو ایک ذریعہ ہے۔ مجھے لذت سماع سے محروم نہ کیجیے۔ ڈاکٹر انجمن آرا کا پتا اس خط کی دوسری جانب ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خط میں ایک انتہائی ضروری کام سے لکھ رہا ہوں۔ فوراً توجہ فرمائیے۔

۱۔ ڈاکٹر تصدق حسین خالد[۹۴] اور
۲۔ ایم اسلم[۹۵]

کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات فون پر لکھوا دیجیے:

(۱) تاریخ وفات
(۲) مدفن (یعنی کون سا قبرستان)
(۳) مرض الموت

مالک رام کی کوئی کتاب پریس جا رہی ہے، اس کے لیے یہ معلومات درکار ہیں۔ ان دونوں جنازوں میں آپ شریک تھے۔ اگر ضرورت ہو تو بیگم سلمیٰ تصدق [۹۶] اور ایم اسلم کے گھر والوں سے معلوم کر لیجیے۔

باقی باتیں فون پر۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۳۔۷۔۹۱ء

میں نے اپنی کتابت کا عکس محمد عالم مختار حق صاحب

کو بھیج دیا ہے۔ م خواجہ

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
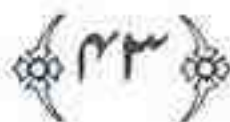
حضرت من۔ آداب۔

پرسوں ایک جاپانی طالب علم کے ذریعے آپ کے نیگیٹو، ساقی فاروقی کی کلیات اور ڈاکٹر نور الحسن نقوی کی اقبال پر کتاب کا مسودہ بھیج چکا ہوں۔ امید ہے یہ چیزیں آپ کو مل گئی ہوں گی۔ اس جاپانی کا نام یاد نہیں رہا۔ یہ شعبہ تاریخ کا طالب علم ہے اور پروفیسر محمد اسلم صاحب [۹۷] کا شاگرد۔

افتخار عارف صاحب سے بات ہوئی تھی، وہ مزید کارروائی کا وعدہ کر گئے ہیں۔

میں فون پر تقاضا کرتا ہوں تو آپ ہنس دیتے ہیں۔ آپ کی ہنسی مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ آپ بھی میری وجہ سے کسی مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ (معمول سے زیادہ ہنسنا پڑتا ہے۔) کتاب چھاپنے سے پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کے ادارے کے حالات اچھے نہیں ہیں، میں کوئی اور ذریعہ تلاش کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا، تمھاری کتاب چھاپنے کے لیے کوئی نہ کوئی انتظام کر ہی لوں گا۔ اب معلوم ہوا کہ آپ کے ذہن میں ''انتظام'' کا تصور کیا تھا۔ گویا آپ کی نظر میری ہی جیب پر تھی۔ نومبر میں جب آپ کراچی آئے تو آپ نے فرمایا، گرانٹ کے کاغذات داخل کر دیے ہیں، جلد ہی رقم بھجوا دوں گا۔ کاغذات داخل ہو کر خارج بھی ہو گئے اور نومبر سے مارچ آ گیا۔ آپ نے بیس روز پہلے آٹھ ہزار کا چیک بھیجنے کو کہا تھا، وہ بھی نہ ملا۔

صورت حال یہ ہے کہ میں نے ساری نقد رقم کے ڈیفنس سرٹیفکیٹ خرید رکھے ہیں۔ اگر ضرورت کے لیے جون سے پہلے کیش کراؤں گا تو سال بھر کا منافع سوخت ہو جائے گا۔ کچھ حصہ بیچ کر چار ہزار کا نقصان اٹھا چکا ہوں۔ آپ کی خاطر مزید نقصان بھی اٹھا سکتا ہوں مگر یہ نقصان ایسا ہو گا جس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ پھر دوسری کتاب کی کتابت بھی شروع کرا رکھی ہے۔

اگر میں کتاب خود چھاپتا تو دسمبر تک اپنی لاگت کے مطابق کتابیں ٹھکانے لگا چکا ہوتا، باقی دوستوں میں مفت تقسیم کر کے

دوسری کتاب چھاپ لیتا اور یوں فضولیات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا۔

یہ خط پڑھ کر بھی آپ ہنسیں گے، لیکن یہ اطمینان ہے کہ ٹیلی فونی ہنسی کی طرح اس کی آواز مجھ تک نہیں آئے گی۔ ویسے مزید اطمینان کی بات یہ ہے کہ یہ خط آپ تک نہیں پہنچے گا۔ اس قسم کے خط عموماً ڈاک خانے والے ضائع کر دیتے ہیں۔

حمزہ فاروقی کی کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ کم از کم اس کی اپنی صورت سے تو اچھی ہے۔

اظہر جاوید آئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ''تحقیق نامہ'' انھیں نہیں ملی۔ کسی غیر مستحق سے واپس لے کر انھیں دے دیجیے۔

خدا کرے یہ خط آپ کی طبع نازک پر گراں نہ ہو، اس لیے میں نے بہت باریک کاغذ پر لکھا ہے، حروف بھی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ بڑے لفظ خط کو وزنی کر دیتے ہیں۔ باتیں بھی ہلکی پھلکی ہیں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۴۔۳۔۹۲ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

حضرت من۔ سلام مسنون۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ دوست اور دشمن سے یکساں سلوک کرنا چاہیے۔ ان بزرگ کے قول پر فی زمانہ آپ ہی عمل کر رہے ہیں۔

اب تو آپ نے فون کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

اللہ اللہ

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

خیر خواہ

عرف

قرض خواہ

۲۲۔۷۔۹۲ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون۔

امید ہے میرا دوسرا پیکٹ بھی مل گیا ہوگا۔ اس میں کتابوں کے علاوہ اقبال از احمد دین کا ایک نسخہ بھی ہے۔ جس پر میں نے طباعت کے لیے ہدایات لکھ دی ہیں۔ آج تیسرا پیکٹ رجسٹری سے بھیج رہا ہوں، اس میں تحقیق نامہ کی کاپیاں ہیں۔

طاہر مسعود صاحب کو کتاب کے دو نسخے مل گئے ہیں۔ ان کا فون خراب ہے۔ اس لیے آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ طاہر صاحب کتاب لے کر میرے پاس آئے۔ بہت اچھی چھپی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس میں حمزہ فاروقی کی کتاب کی طرح آپ نے ٹائٹل پیپر نہیں لگایا۔ صاف ستھرا کاغذ ہے۔ شروع کے آٹھ صفحات میں بعض فاش غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً یہی کہ منشی محبوب عالم کا نام اور ان کی کتاب کا نام نہیں آیا۔ قاری جب تک مقدمہ پڑھ نہ لے، اسے معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ کتاب کے نام میں "نادر" کا لفظ کیوں شامل ہے۔ دوسرے صفحے پر ناشر، فاشر چھپا ہے۔ صفحات کے آگے تعداد لکھی ہے اور تعداد کے آگے صفحات لکھ دیے ہیں۔ ص ۵ پر فہرست کا عنوان غائب ہے۔ اور پھر اہم غلطی یہ ہوئی ہے کہ انتساب شامل نہیں ہوا۔ طاہر صاحب نے اپنی والدہ محترمہ کے نام انتساب کیا تھا، یہ جذباتی معاملہ ہے۔ اس لیے اسے ضرور شامل کیا جانا چاہیے۔ ٹائٹل کی کتابت بھی جاذب توجہ نہیں ہے۔ میں شروع کے آٹھ صفحات کی ڈمی بھیج رہا ہوں۔ اس کے مطابق شروع کے آٹھ صفحات دوبارہ چھپوا دیجیے۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۳۰۔۸۔۹۲ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی

لاہور

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون۔

میری کتاب "اقبال" از احمد دین کی رائلٹی کا چیک ملا۔ شکر گزار ہوں۔ اس کی رسید منسلک ہے۔ آپ نے کتاب کی قیمت پچاس روپے مقرر کر کے پانچ سو نسخوں پر دس فی صد رائلٹی ادا کی ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور آپ کی توجہ کے مستحق ہیں۔

۱۔ کتاب کے صفحات ۵۲۸ ہیں۔ اتنی ضخامت کی کتاب پر لاگت کسی طرح بھی تیس ۳۰ روپے فی نسخہ سے کم نہیں آئے گی۔

۲۔ کتاب کی قیمت پچاس روپے ہوگی۔ تاجران کتب کو پچاس فی صد رعایت دی جائے گی۔ دس فی صد رائلٹی آپ نے مجھے دی ہے۔ اس طرح ساٹھ فی صد کی ادائی کے بعد آپ کو پچاس روپے میں سے صرف بیس روپے بچت ہوگی۔ گویا دس روپے فی نسخہ آپ کو نقصان ہوگا۔

۳۔ کتاب کی کتابت میری ملکیت ہے۔ بارہ سال پہلے میں نے یہ کتابت ۔/۱۴ روپے فی صفحہ اجرت پر لکھوائی تھی۔ آپ اگر اسے استعمال کریں گے تو کچھ نہ کچھ اس کا معاوضہ بھی ہونا چاہیے۔

۴۔ آپ نے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے میری کتاب ''تحقیق نامہ'' شائع کی ہے۔ اس کے صفحات مذکورہ کتاب سے ایک سو کی تعداد میں کم ہیں۔ اس کے باوجود اس کی قیمت ۔/۱۵۰ روپے ہے۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۲۶۔۱۰۔۹۲ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

سیکرٹری بزم اقبال

لاہور

حضرت من۔ تسلیمات۔

پانچ روز آپ کے ساتھ خواب کی طرح گزر گئے۔ آپ سے بے شمار باتیں ہوئیں، مگر بہت سے سخن ہائے گفتنی، ناگفتہ رہ گئے۔ حالاں کہ فسادِ خلق کا خوف بھی نہیں تھا۔ شہر میں آپ کے مضمون کا چرچا ہے۔ کئی لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ کا مضمون ''حاصل مشاعرہ'' تھا۔ اس کی نوک پلک سنوار کر، ہو سکے تو کچھ اضافہ کر کے جلد بھجوا دیجیے۔ انجمن والے مقالے کی طرح اسے ڈیپ فریزر میں نہ رکھیے گا۔

مظفر علی سید کو فون ضرور کر دیجیے۔ رسالہ غالبؔ پر انھوں نے جو کالم لکھا ہے، اس کا عکس بھی مانگ لیجیے گا۔

جنگ کا تبصرہ میری جیب ہی میں پڑا رہ گیا۔ وہ اب بھیج رہا ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۶۔۱۱۔۹۲ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

حضرت من۔ سلام مسنون۔

آخر کار میں آ ہی رہا ہوں۔ اقبال ایوارڈ کی میٹنگ ۱۵ جنوری کو ہے۔ ۱۴ کو لاہور پہنچوں گا اور اس وقت تک لاہور میں رہوں گا جب تک کہ آپ شہر سے اخراج کا حکم صادر نہیں فرمائیں گے۔

ڈاکٹر نورالحسن نقوی کا اتھارٹی لیٹر بھیج رہا ہوں۔ ان کی کتاب کا معاوضہ متعلقہ شخص کو بھجوا دیجیے۔

باقی باتیں لاہور میں، یا اس سے پہلے فون پر۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۳۱-۱۲-۹۲ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون۔

لاہور میں میرے حال پر آپ کی جو عنایات رہیں، ان کا شکریہ ادا کر سکتا تو ضرور کرتا۔ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ کا دست شفقت میرے سر پر رہا۔ چند امور آپ کی توجہ کے طالب ہیں۔

۱۔ اعجاز بٹالوی صاحب ۹۸ سے لاہور میں عالی کے ساتھ شام کا جو پروگرام بنا تھا، اسے پایہ تکمیل کو پہنچایئے۔ اعجاز صاحب نے تمام مالی اخراجات کی ذمہ داری لی ہے۔ اخراجات صرف یہی ہوں گے کہ جس ہوٹل میں جلسہ ہوگا، اس کے بل کی ادائی اور کراچی سے دو مقالہ نگاروں کے آنے جانے اور قیام کا خرچہ، گویا ۲۰-۲۵ ہزار کا صرفہ ہوگا۔ اعجاز صاحب سے بات کر کے مطلع فرمایئے۔

۲۔ ڈاکٹر رشید جالندھری صاحب نے از رہ کرم ایس ایم اکرام ۹۹ کی پاکستانی کلچر کے متعلق کتاب (انگریزی) عنایت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ کتاب جلد سازی میں تھی۔ ان سے ایک نسخہ حاصل کر کے ڈاک سے بھیج دیجیے۔

۳۔ لاہور کی عمران بیکری سے جو Die+ بسکٹ خریدے جاتے ہیں، ان کے بارے میں بیکری کے مالک سے میں نے معلوم کیا

تو اس نے بتایا کہ ان میں چینی استعمال کی جاتی ہے۔ لہٰذا آیندہ کے لیے یہ سلسلہ بند۔ آپ بھی انھیں استعمال نہ کیجیے۔ ان میں چینی کی مقدار خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ نیز یہ میدے سے بنائے جاتے ہیں۔

میں نے جو کتابیں لاہور سے بذریعہ ڈاک بھیجی تھیں، وہ مجھ تک پہنچ گئی ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۹۴/۱/۶ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون۔

کل ایک رجسٹری لفافہ بھیجا ہے جس میں اقبال اکیڈمی کی رکنیت کا فارم اور ایک ہزار روپے کا چیک ہے۔ آج 'تکبیر' کے تازہ شمارے میں معین الدین عقیل کے مضمون سے معلوم ہوا کہ ملیشیا کے اسلامی مرکز نے اردو، فارسی اور عربی کے مخطوطات کی فہارس شائع کی ہیں۔ تینوں کی ایک ایک جلد۔ سہیل عمر صاحب یہ اپنے ساتھ لائے ہوں گے۔ ان کے عکس اپنے لیے بھی بنوایئے اور میرے لیے بھی۔ اگر وہ نہ لائے ہوں تو ان سے کہہ کر منگوا کر دیں۔ اقبال اکیڈمی کے کتب خانے کے لیے اگر آپ منگوا لیں تو پھر مجھے عکس بنوانے میں سہولت ہو جائے گی۔

اردو کی جلد میں چار سو کے قریب مخطوطات کا ذکر ہے۔ یہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر کے مخطوطات ہیں جو انھوں نے ملیشیا کے اسلامی مرکز کو فروخت کیے ہیں۔ اس فہرست کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہوں، اس لیے آپ کو خط لکھ دیا۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۸۴-۶-۳۱ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

﴿۵۱﴾

حضرت من۔ سلام مسنون۔

بہت دنوں سے آپ نے فون نہیں کیا، آخر کیوں؟

''دیوانِ غمگین'' ملا۔ اس میں عرض ناشر میں آپ نے لکھا ہے کہ غمگین کی ڈائری مولانا عرشی ؒ نے شائع کر دی تھی۔ یہ درست نہیں ہے۔ اس کا فارسی متن کبھی شائع نہیں ہوا۔ اردو ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی نے کیا تھا جسے ایوب قادری نے مرتب کیا تھا اور یہ ترجمہ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے کراچی سے شائع کیا تھا۔ یہ غلطی ایسی ہے کہ اس کا آپ سے انتساب کسی صورت مناسب نہیں ہے۔

عرض ناشر کی پہلی سطر میں لکھا ہے کہ غمگین انیسویں صدی کے عام مصنفین میں سے تھے۔ یقیناً آپ نے اہم لکھا ہو گا، ورنہ عام کیا؟

ضروری: اقبال اکیڈمی کا کوئی رسالہ مجھے ملا ہے نہ کوئی کتاب۔ دو مہینے پہلے آپ نے کہا کہ رسالے بھیجے جا رہے ہیں۔ پچھلے دو تین مہینوں سے جو کچھ چھپا ہے بھجوا دیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۸۔۹۔۹۴ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

﴿۵۲﴾

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون۔

ایک عرصے سے آپ نے فون نہیں کیا۔ خیریت تو ہے؟

جس روز عارف افتخار کے مقتدرہ کے چیئرمین ہونے کا اعلان ہوا تھا، اسی روز ان کا فون آیا تھا۔ وہ آپ سے ملیں گے اور اپنے کاموں میں رہنمائی چاہیں گے۔ آپ ان سے پوری طرح تعاون کیجیے گا۔

ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی) نے حسرت موہانی پر ایک کتاب لکھی ہے، جو دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ وہ اس کتاب کو پاکستان سے چھپوانا چاہتے ہیں۔ میں نے انھیں لکھا ہے کہ اس کے دو نسخے آپ کو بھیج دیں اور میرے حوالے سے آپ کو لکھیں کہ اسے مغربی پاکستان

اردو اکیڈمی سے شائع کردیا جائے۔ امید ہے آپ اس کتاب کی اشاعت کا انتظام کرادیں گے۔

میرزا ادیب صاحب کے بارے میں آپ کو علم ہوا ہوگا کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے، میں نے کل فون پر خیریت معلوم کی تھی۔ ان کے بیٹے نے بتایا کہ وہ اب پہلے سے بہتر ہیں۔ آپ انھیں دیکھنے جائیں تو میری طرف سے مزاج پرسی کیجیے گا۔

اقبال اکیڈمی اور اردو اکیڈمی کی طرف سے کوئی نئی چیز ایک عرصے سے نہیں آئی۔

ہم دونوں کی طرف سے بھابھی کی خدمت میں آداب۔ نورین کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۹۔۲۔۹۵ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

لاہور

﴿۵۳﴾

۳ ڈی۔ ۹/۲۶ ناظم آباد کراچی

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون۔

آپ سے اب کی ملاقاتیں تو ہوئیں مگر تنہائی کی ملاقات نہ ہو سکی اور اس کا سبب یہ ہے کہ آپ لاہور میں نہ تھے۔ لاہور میں آپ ہوتے تو حسب سابق پورا دن آپ کے ساتھ گزرتا۔

اتفاق سے ایس یو خان صاحب سے اکیڈمی کی گرانٹ کی بات ہوئی تھی۔ کچھ گنجایش نکل آئی ہے۔ میں نے فارم حاصل کر لیا ہے۔ اسے پُر کرا کے اور ضروری کاغذات کے ساتھ خان صاحب کو گھر کے پتے پر بھجوا دیجیے۔ ساتھ ہی فہرست مطبوعات کے دو نسخے بھی بھیج دیجیے، اس میں تاخیر ہرگز نہ ہو۔

باقی حالات بدستور ہیں۔

آمنہ سلام لکھوا رہی ہیں۔ بھابھی صاحبہ کی خدمت میں ہم دونوں کا آداب۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۲۸۔۴۔۹۸ء

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، لاہور

حضرت من۔ آداب۔

اکیڈمی کی کتابوں پر جو تبصرے شائع ہوئے ہیں، ان کے تراشے منسلک ہیں۔ ایک تراشہ مقتدرہ کے بارے میں ایک کالم کا بھی ہے۔ معلوم نہیں اس کا نویسندہ کون نطفۂ بے تحقیق ہے کہ آپ کا دشمن معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کی دونوں کتابوں کے بارے میں گزارش ہے کہ انھیں یک جا شائع کر دیجیے۔ ضخامت زیادہ نہیں ہوگی۔ دونوں کتابوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ جہاں آپ دوسروں کی خاطر بہت سی کتابیں چھاپتے ہیں، میری خاطر یہ دونوں کتابیں چھاپ دیجیے۔

فضلی سنز کی طرف جو رقم آپ کی واجب ہے، اس کے سلسلے میں فضلی سنز کے نام تقاضے کا خط لکھ کر میرے پتے پر بھجوا دیجیے۔ ان شاء اللہ میں بہت جلد ادائی کرا دوں گا۔

آمنہ پانچ ماہ سے اپنی بہن کی تیمارداری کے سلسلے میں اسپتال میں ہیں۔ ۲۴ گھنٹے وہیں رہتی ہیں۔ اس دوران میں خود بھی حادثے کا شکار ہو گئیں۔ ایک دن ٹھوکر لگی اور گر گئیں۔ کنپٹی پر زخم آیا۔ اب بہتر ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۳۔۸۔۹۹ء

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
لاہور

حواشی

۱۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کا سہ ماہی رسالہ، جس کے مدیر مکتوب نگار تھے۔

۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کا ماہ نامہ رسالہ، جس کے مدیر مکتوب نگار تھے۔

۳۔ رسالۂ اردو کے لیے دوسرا موضوع جس پر میں نے مضمون لکھ لیا تھا۔ "گلزار ارم" از میر حسن کے ایک نسخے پر تھا جو یونیورسٹی لائبریری کی ایک بیاض میں شامل ہے اور ۱۲۱۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ میرے اسی شاگرد کرم فرما کو اس کی بھی خبر ہو گئی تھی اور کچھ عرصے کے لیے یہ قلمی نسخہ بھی کتابوں میں آگے پیچھے کر دیا ہے۔ اب سنا ہے کہ اس بیاض پر اور میرے مطبوعہ نسخے پر ایک مضمون لکھ کر ان صاحب نے آپ کو ارسال کیا ہے اور رسالہ اردو میں ان کا مقالہ شائع ہو رہا ہے۔ اکرام چغتائی نے یہاں کے بعض صاحبوں سے مل کر یہ مہم چلا رکھی ہے اور اس کا پس منظر یہاں کی سیاست ہے، جس سے

آپ بھی باخبر ہیں۔ بہر حال مقالہ میں نے پورا کر لیا ہے۔ معلوم نہیں اب آپ اس کو شائع کرنا پسند کریں گے یا اکرام چغتائی کا مقالہ شائع ہوگا .... 'گلزار ارم' (قلمی نسخہ) پر نوٹ بھیجوں گا۔ اکرام چغتائی کا مقالہ چھپے گا؟ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ اکرام کا مقالہ مجھے بھیج دیں اور وہ مضمون میرے اختلافی نوٹ کے ساتھ شامل ہو۔'' ڈاکٹر وحید قریشی بنام مشفق خواجہ۔ خط پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے۔ لفافے پر جنرل پوسٹ آفس کراچی کی مہر کی تاریخ ۱۴ جولائی ۲۶ء ہے۔ ظاہر ہے کہ زیر حوالہ خط مذکورہ تاریخ سے چند روز پیشتر لکھا گیا ہوگا۔

۴۔ کشن چند اخلاص (کشمیری) کا تذکرہ جسے مکتوب الیہ نے مرتب کیا ہے۔

۵۔ پ: ۲۰ ستمبر ۱۹۱۱ء (بہمن۔ ضلع لاڑکانہ) م: ۱۱ اپریل ۱۹۸۲ء (کراچی۔ تدفین: مکلی، ضلع ٹھٹھہ)۔ سندھی، اردو اور فارسی زبانوں کے معروف محقق، مترجم، مرتب اور ادیب۔ علمی آثار: مہران جو موجوں، مرزا اغازی بیگ مرخان اور اس کی بزم ادب ہفت مقالہ، حواشی مکلی نامہ، حالات فیضی، تذکرہ شعرائے کشمیر (۴ جلدیں)، دود چراغ محفل۔

۶۔ آمنہ مشفق (آمنہ صدیقی ایم اے، بی ایڈ)، مکتوب نگار کی اہلیہ۔ علمی آثار: ''افکار عبدالحق'' (مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔ پہلی اشاعت ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء)

۷۔ آصفہ صدیقی۔ آمنہ مشفق کی چھوٹی بہن۔

۸۔ تذکرہ ہمیشہ بہار

۹۔ ''شاہ نصیر کے چھوٹے بیٹے، شاہ نجم دین کے نواسے، شاہ بہاء الدین بشیر عرف میاں عبداللہ شاہ۔ شاعر، تذکرہ نگار، بشیر کے تذکرے کا اولین تعارف مکتوب نگار نے کرایا تھا'' (اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۸ء۔ ص ۴۱۵)

۱۰۔ ''سخن شعرا'' عبدالغفور خاں نساخ۔ پ: عید الفطر ۱۲۴۹ھ مطابق فروری ۱۸۳۴ء (کلکتہ) م: جمعہ، ۴ شوال ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۸۹ء۔ شاعر، تذکرہ نگار۔ سخن شعرا اردو میں ہے اور اس میں قدما سے لے کر معاصرین تک دو ہزار چار سو بچاسی شعرا کا ذکر آیا ہے۔ ان میں انتالیس شاعرات بھی شامل ہیں۔ اردو یا فارسی زبان میں جتنے تذکرے ۱۸۸۰ء تک لکھے گئے ہیں سخن شعرا ان میں سب سے ضخیم ہے۔ (ایضاً)

۱۱۔ سعادت خاں ناصر کا تذکرہ۔ مرتبہ مکتوب نگار، مطبوعہ مجلہ ترقی ادب، لاہور (۱۹۷۰ء)۔ مرتب نے بعض شواہد کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''ناصر ۱۲۲۰۔۱۲۲۱ھ کے قریب پیدا ہوئے اور ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۷ء اور ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء کے درمیان کسی سنہ میں (لکھنو) میں انتقال کیا۔''

ایک تذکرہ (خوش معرکۂ زیبا) اور پانچ دیوان ان سے یادگار ہیں۔ بعض فارسی تصانیف کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔

۱۲۔ امتیاز علی تاج۔ پ: ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۰ء (دیو بند، بھارت)۔ م: ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو لاہور میں قتل کر دیے گئے۔ (تدفین: موسن پورہ، لاہور)۔ شمس العلماء ممتاز علی کے فرزند۔ ممتاز ادیب اور ڈراما نگار۔ علمی آثار: ''قرطبہ کا قاضی''، ''بھارت سپوت'' اور ''انار کلی''۔

۱۳۔ پ: ۲۵ دسمبر ۱۹۱۴ء (بیدی، ضلع بجنور۔ بھارت) م: ۲۹ جون ۱۹۷۹ء (لاہور)۔ معروف محقق، مترجم، مصنف۔ سابق استاد یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔ علمی آثار: افادات غالب۔ مقالات منتخبہ (۲ جلدیں) کوروش اعظم (ترجمہ) ارمغان دانش گاہ (مرتبہ فارسی مقالات کا مجموعہ)

۱۴۔ گلستان سخن، ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا۔ مرزا قادر بخش صابر دہلوی۔ پ: ۱۲۲۳ھ (شاہ جہان آباد)۔ م: ۱۲۹۹ھ۔ شاعر اور تذکرہ نگار۔ علمی آثار: دیوان صابر (مرتبہ سید محمد سلطان عاقل دہلوی) اور گلستان سخن (تذکرہ)

۱۵ قدرت اللہ شوق۔م:۱۲۲۴ھ (مطابق ۱۸۰۹ء)۔شوق اردو کے قادر الکلام شاعر اور اپنے زمانے کے استاد فن تھے۔طبقات الشعرا کے اب تک چار نسخوں کا سراغ مل چکا ہے۔تذکرے کی زبان فارسی ہے۔کتب خانۂ آصفیہ کے نسخے کو بنیاد بنا کر نثار احمد فاروقی نے مکمل متن تیار کیا اور ایک بسیط مقدمہ بھی سپر دِ قلم کیا۔اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۸ء میں شائع کر دیا۔(اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

۱۶ مثنوی سحر البیان

۱۷ نجم الدین آبرو معروف بہ شاہ مبارک۔خان آرزو کے شاگرد۔

۱۸ کوائف دستیاب نہ ہو سکے۔اگر کوئی قاری اس سلسلے میں مدد کر سکے تو مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان مکمل مراسلت کو کتابی شکل میں مرتب کرتے ہوئے، فراہم کردہ کوائف سے شکریہ کے ساتھ استفادہ کیا جائے گا۔

۱۹ سر سید احمد خاں کے لائق فرزند۔کوائف کے مقام آسانی دستیاب ہیں۔

۲۰ میر کاظم علی مبتلا کا تذکرہ۔مکتوب نگار نے گلشن سخن مرتبہ مسعود حسن رضوی مطبوعہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء پر تبصرہ کرتے ہوئے داخلی شہادتوں کی مدد سے بہت سے اعتراضات وارد کیے تھے۔

۲۱ طبقات الشعرا۔تفصیل کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۵۔

۲۲ کوائف دستیاب نہ ہو سکے۔دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸۔

۲۳ مجلس ترقی ادب، لاہور کا سہ ماہی رسالہ، مکتوب الیہ جس کے مدیر تھے۔

۲۴ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کا مرحوم سہ ماہی رسالہ جس میں صرف سیاسیات اور تاریخ پر مقالات شائع ہوتے تھے۔

۲۵ حافظ عبدالرحمٰن خان احسان۔م:۱۲۶۷ھ (دہلی)۔مرزا فرخندہ بخت بہادر ابن شاہ عالم کے استاد اور مختار۔تذکرہ گلستان سخن کے مصنف۔مرزا قادر بخش صابر دہلوی بھی ان کے شاگرد تھے۔

۲۶ مکتوب نگار نے، مرتبہ تذکرے میں احسان لکھنوی کے حالات کا علیحدہ باب باندھا ہے۔

۲۷ تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸

۲۸ تذکرہ نگار راجہ جنم جی متر ارمان۔پ:۱۵ اکتوبر ۱۷۹۶ء۔م:۲۵ اگست ۱۸۶۹ء۔اسد اللہ خاں غالب کے ہم عمر اور ہم عصر۔شاعر، تذکرہ نگار۔ ارمان کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور بنگلہ، اردو، فارسی اور برج بھاشا سب میں شعر کہتے تھے۔''نسخۂ دلکشا'' ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء سے لے کر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء کے درمیان مکمل ہوا اور پہلا حصہ ۱۸۷۰ء میں طبع ہوا۔دوسرا حصہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔غیر منقسم ہندوستان کے نامور محقق آثار قدیمہ ڈاکٹر راجہ راجندر لال متر، ارمان کے فرزند تھے۔(اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

۲۹ ۳۔ڈی، ۹/۲۶، ناظم آباد، کراچی۔نئے مکان میں منتقل ہونے سے قبل مکتوب نگار کا قیام، والدین کے ہمراہ، سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں تھا۔

۳۰ ایسی کتابوں میں مکتوب نگار کے علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے، کبھی عزیز و اقارب مستفید ہوتے رہے، راقم اس انبوہ کثیر کا پہلا شہسوار تھا۔

۳۱ سہ ماہی ''معاصر'' پٹنہ۔

۳۲ امیر الدین احمد کا تذکرہ۔پورا نام ابوالحسن امیر الدین احمد امر اللہ۔(ابوالحسن ان کی کنیت، امر اللہ عرف اور حقیقی نام امیر الدین احمد)۔

پ: ۱۱۷۰ھ۔ ۱۱۹۲ھ میں مصنف نے تذکرے کی بنیاد ڈالی اور ایک سال کے اندر یعنی ۱۱۹۳ھ میں اسے مکمل کر لیا۔ نظر ثانی اور اضافے کا سلسلہ ۱۱۹۵ھ کے بعد تک جاری رہا۔ اس تذکرے کے دو مخطوطوں کا سراغ اب تک لگا ہے۔ ایک آکسفورڈ یونی ورسٹی کے کتب خانے میں ہے، دوسرا خدا بخش لائبریری پٹنہ میں۔ نسخۂ آکسفورڈ میں ۲۵۴ اور نسخۂ پٹنہ میں ۲۵۶ شاعروں کے تراجم شامل ہیں۔ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور انگریزی اور اردو میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ (اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری)۔

۳۳ مکتوب الیہ کا شعری مجموعہ۔

۳۴ خوش معرکۂ زیبا کے صفحہ ۵ پر آپ نے جس عبارت کی طرف اشارہ کیا ہے:

''منا حک کہ نمک مجلس اور تر حال صحبت تھے''

''تردست'' (چالاک) اور ''تر زبان'' (باتونی) تو سنا ہے ''تر حال'' کا کوئی مقام نہیں۔ فارسی میں ایک لفظ ''ترخان'' ہے۔ اس سے ''ترخانی کردن'' مجازاً بمعنی طنز و تمسخر آتا ہے۔ عجب نہیں کہ ''ترخان صحبت تھے'' کہا گیا ہو۔ محسن فانی کا شعر ہے:

کارہا ترخانی و طنز و مزاح افتادہ است

خدمت صد سالہ و فضل و ہنر منظور نیست

کسی زمانے میں یہ شعر ''بہار عجم'' (ٹیک چند بہادر) میں لفظ ترخان کے تحت دیکھا تھا، وہاں سے تصدیق کر لیں۔ آیا پہلا مصرع اسی طرح ہے۔ (ڈاکٹر وحید قریشی بنام مشفق خواجہ۔ خط پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے۔ لفافے پر جنرل پوسٹ آفس، کراچی کی مہر کی تاریخ ۲۱ مئی ۶۸ء ہے)

۳۵ مصنف کا پورا نام خیراتی لعل اور تخلص بے جگر ہے۔ تذکرہ بے جگر کا اب تک صرف ایک قلمی نسخہ خود مولف کے ہاتھ کا لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے۔ اس میں نہ دیباچہ ہے، نہ خاتمہ اور نہ کسی دوسرے تذکرے میں بے جگر کے حالات ملتے ہیں۔ یہ تذکرہ انڈیا آفس، لندن میں محفوظ ہے۔ (اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری) مکتوب الیہ کے کتب خانے میں اس تذکرے کی ایک فوٹو کاپی موجود تھی، جس سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مکتوب نگار کی معرفت استفادہ کیا۔

۳۶ ممتاز لیاقت کی تصنیف۔ یہ کتاب ڈاکٹر سید عبداللہ کے ایما پر پروفیسر وقار عظیم کے خلاف لکھی گئی اور ان پر سرقے کا الزام عائد کیا گیا۔ اس کتاب کا مواد بھی ڈاکٹر سید عبداللہ اور ان کے رفقا نے فراہم کیا۔

۳۷ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ پ: ۱۵راگست ۱۹۲۴ء۔ م: ۱۳ جون ۲۰۰۷ء۔ شام چوراسی (لاہور) سابق استاد اورینٹل کالج لاہور، سابق صدر نشین بزم اقبال لاہور۔ معروف ماہر اقبالیات، مورخ، مصنف، مولف۔ ڈاکٹر صاحب نے قابل قدر علمی آثار یادگار چھوڑے ہیں۔ چند اہم تصنیفات: تاریخ یونی ورسٹی اورینٹل کالج، اردو شاعری کا سماجی پس منظر، اقبال کا ذہنی ارتقا، تاریخ جامعہ پنجاب، مطالعۂ اکبر، مولانا ظفر علی خاں۔ حیات، خدمات و آثار، جلیانوالہ باغ کا قتل عام اور مظالم پنجاب، جدوجہد آزادی میں پنجاب کا کردار، میاں سر فضل حسین کا کردار۔ تاریخ کے آئینے میں، جگر لخت لخت، مردم دیدہ و شنیدہ۔

۳۸ ڈاکٹر محمد باقر۔ پ: ۴راپریل ۱۹۱۰ء (لاہور بنگلہ، فیصل آباد) م: ۲۵ اپریل ۱۹۹۴ء (لاہور) سابق پرنسپل یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور۔ معروف محقق، مصنف، اور افسانہ نگار۔ چند علمی آثار: شعرائے پنجاب، احوال و آثار اقبال، احوال و تعلیمات شیخ ابوالحسن ہجویری داتا گنج بخش،

۳۹۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ پ: ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء (جبل پور، بھارت) م: ۲۵ ستمبر ۲۰۰۵ء (حیدرآباد سندھ) نامور محقق، نقاد، مصنف، ماہر تعلیم، مذہبی سکالر اور روحانی پیشوا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی، اردو میں ایم اے کرنے کے بعد کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی میں لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ناگپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی سند حاصل کی۔ سندھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے علامہ آئی آئی قاضی کی رفاقت میں کام کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے نوے کے قریب (انگریزی اور اردو میں) علمی آثار یادگار چھوڑے ہیں جن میں حالی کا ذہنی ارتقا اور اقبال اور قرآن جیسی معرکہ آرا تصانیف بھی شامل ہیں۔

۴۰۔ کوائف دستیاب نہ ہو سکے۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸

۴۱۔ مکتوب نگار کا مقالہ ۱۹۶۹ء میں مکمل ہوا اور صحیفہ کے غالب نمبر (جلد دوم وسوم) میں شائع ہوا۔ بعد میں مزید مواد دستیاب ہونے پر از سر نو لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ مقالہ ۱۹۸۱ء میں عصری مطبوعات، کراچی نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

۴۲۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی۔ پ: ۷؍اپریل ۱۸۳۴ء۔ م: ۱۲ مئی ۱۸۹۰ء۔ شاعر، تذکرہ نگار، داستان گو، سوانح نگار، مورخ، ناول نگار، قواعد نویس اور مکتوب نگار۔ سادات بلگرام میں سے تھے۔ غالب کے شاگرد، شاد عظیم آبادی کے استاد۔ ان کے نام غالب کے چھ خطوط دستیاب ہو چکے ہیں۔

۴۳۔ تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸

۴۴۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۹

۴۵۔ لاہور کا معروف اشاعتی ادارہ۔ سنگ میل پبلی کیشنز

۴۶۔ ۱۹۶۸ء میں مکتوب الیہ نے ۱۸۰۰ سی سی کی سوزوکی کار خرید لی تھی۔ اس سے پیشتر موٹر سائیکل پر سواری فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سے لطیفے زبان زد خاص و عام ہیں۔

۴۷۔ انتہائی مختصر اشارے کی وجہ سے کتاب کا تعین نہ ہو سکا۔ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ نے بعض سے رجوع کیا لیکن تسلی بخش جواب دستیاب نہ ہو سکا۔

۴۸۔ پ: اکتوبر ۱۹۰۸ء (میرٹھ، یوپی) م: ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء (کراچی)۔ محقق، نقاد، مصنف، ماہر لسانیات، مدیر اعلیٰ اردو لغت، ترقی اردو بورڈ، کراچی (۱۹۶۱ء۔ ۱۹۷۳ء) قابل قدر علمی آثار۔ اردو قواعد، اردو زبان کا ارتقا، داستان زبان اردو، لسانی مسائل، اردو لسانیات، نئی پرانی قدریں، معیار ادب، غالب۔ فکر و فن، فلسفۂ کلام غالب۔

۴۹۔ مکتوب الیہ دفتری سیاست کی وجہ سے شدید پریشان تھے۔ ان کے مخالفین کے خلاف مکتوب نگار کے پاس اہم مواد تھا۔ جسے مکتوب الیہ استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں دونوں حضرات کے مابین چند خطوط کا تبادلہ ہوا، لیکن ان خطوط میں مطلوبہ مواد کے متعلق ہلکا سا اشارہ بھی نہیں۔ مکتوب الیہ کے ایک خط سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

۵۰۔ بشیر احمد ڈار۔ پ: ۱۹۰۸ء (لاہور)۔ م: ۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء (لاہور) ممتاز ماہر اقبالیات، سابق ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی۔ تصانیف: انوار اقبال، اقبال اور احمدیت، فلسفۂ اقبال کا مطالعہ (انگریزی)، اقبال کا معاشرتی فلسفہ (انگریزی) اقبال کے خطوط (انگریزی)، اقبال کے خطوط اور تحریریں (انگریزی) پاکستان کیوں؟ (انگریزی)، انگریزی ترجمہ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق۔

۵۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۷

۵۲۔ پ: ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۸ء (جماواں۔ پھول پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی) م: ۳ راگست ۱۹۹۲ء (لاہور)۔ شاعر، نقاد، مترجم، سابق استاد شعبہ انگریزی، اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور۔ سابق استاد اردو، یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔ علمی آثار: تیشۂ لفظ (شاعری)، جوئے معانی (شاعری)، مغرب کے تنقیدی اصول، تہذیب و تحقیق، داستان مغلیہ (ترجمہ)، افتادگان خاک (ترجمہ)، حضرت بلال (ترجمہ)، بدلتی دنیا کے تقاضے (ترجمہ)۔

۵۳۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ پ: ۱۴ اگست ۱۹۲۰ء (بریلی)۔ م: ۱۹ دسمبر ۱۹۹۸ء (لاہور) اصل نام عبادت یار خان۔ ممتاز نقاد، سابق استاد اورینٹل کالج، لاہور، لندن یونیورسٹی اور انقرہ یونی ورسٹی۔ علمی آثار: اردو تنقید کا ارتقا (پی ایچ ڈی کے لیے لکھا گیا مقالہ) تنقیدی زاویے، تنقیدی تجربے، جدید اردو تنقید، غزل اور مطالعۂ غزل، غالب کا فن، غالب اور مطالعۂ غالب، میر تقی میر، خواجہ میر درد، ارض پاک سے دیار فرنگ تک (سفر نامہ)۔

۵۴۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۹

۵۵۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۷

۵۶۔ سرور جہاں آبادی پر ڈاکٹر حکم چند نیر (سابق استاد بنارس یونی ورسٹی) کا مقالہ

۵۷۔ پ: ۸۶-۱۷۸۷ء/۱۲۰۱ھ (ہگلی)۔ م: ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران (لکھنو) شاعر، تذکرہ نگار۔ اختر کا خاندان شروع ہی سے عدلیہ سے وابستہ تھا۔ نام کے ساتھ قاضی کا اضافہ اسی مناسبت کی طرف اشارہ ہے۔ اختر کے تذکرے، آفتاب عالم تاب میں فارسی اور اردو، دونوں زبانوں کے شعرا کے تراجم ہیں۔

۵۸۔ پ: ۱۹۱۳ء (گجرات)۔ م: ۲۶ جون ۱۹۵۷ء (کراچی) اصل نام عبدالمجید چوہان۔ شاعر، کالم نگار، صحافی، مدیر ہفت روزہ ''نمکدان''، کراچی۔ شعری مجموعے: نعرہ جنگ، کان نمک، نمکدان۔

۵۹۔ پ: ۱۱ جولائی ۱۹۱۵ء (سنبھل ضلع مرادآباد) م: ۳۱ جنوری ۱۹۸۵ء (کراچی) معروف ماہر لسانیات، ادیب، ماہر تعلیم۔ مدیر سہ ماہی ''اردو'' اور ماہ نامہ ''قومی زبان'' کراچی۔ علمی آثار: اردو اور بنگلہ کے مشترک الفاظ، اساس اردو، پراچین اردو، اردو کا عوامی ادب، چند تعلیمی تصورات۔

۶۰۔ کوائف دستیاب نہ ہو سکے۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸

۶۱۔ یہ مقالہ مکتوب نگار کی کتاب ''تحقیق نامہ'' (مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۱ء) میں شامل ہے۔ ص ۱۸۱ تا ۱۴۳۔

۶۲۔ ایضاً۔ ص ۱۴۵ تا ۱۷۲۔

۶۳۔ ناقابل خواندگی۔

۶۴۔ پ: ۲۲ جون ۱۹۳۴ء (لاہور)۔ ریٹائرڈ پریس فوٹو گرافر، صحافی اور مصنف۔ تصانیف: بے وفا (ناول) ایوب خاں۔ افکار و تصاویر، زیر طبع: گرد سفر (سفر نامہ) ہوسٹن، ٹیکساس، یو ایس اے میں خوش حال ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔

۶۵۔ پیر حسام الدین راشدی، دیکھیے حاشیہ نمبر ۵

۶۶۔ پ: ۲۳ دسمبر ۱۹۰۶ء۔ م: ۱۶ اپریل ۱۹۹۳ء۔ ماہر غالبیات، اردو، عربی اور فارسی کے ممتاز عالم۔ انڈین فارن سروس (۱۹۳۷ء۔ ۱۹۶۵ء) فارن

سروس سے سبک دوش ہونے کے بعد ساہتیہ اکیڈمی دہلی سے وابستگی، جہاں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے مکمل کام کو مرتب کیا۔ یادگار علمی آثار: ذکر غالب، تلامذہ غالب، گل رعنا (غالب)، کربل کتھا (فضلی) مختار الدین آرزو کے ساتھ مل کر مرتب کی۔ عورت اور اسلامی تعلیم (اردو، عربی، انگریزی)، مراۃ فی الاسلام، اسلامیات۔

۶۷۔ پ: ار اپریل ۱۹۱۵ء (امرتسر، بھارت)۔ م: ۱۳ اپریل ۱۹۹۷ء (لاہور) سابق وائس چانسلر بہاول پور یونیورسٹی۔ سیرت نگار، محقق، ادیب۔ بہت سے علمی آثار یادگار چھوڑے جن میں ان کی قابل قدر تصنیف "پیغمبر اعظم و آخر ﷺ" بھی شامل ہے جسے ۱۹۷۸ء میں کتب سیرت کے عالمی مقابلے میں تیسرے انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔

۶۸۔ اکتوبر کے شمارے میں کلام نگار شائع کیا جا رہا تھا۔ ایک طائر کی زبانی اطلاع ملی ہے کہ درگا پرشاد (اکرام چغتائی) نے بھی یہ کلام لے کر صحیفہ سے پہلے شائع کرنے (کی) ٹھانی ہے۔ "فنون" کے دسمبر کے شمارے میں یہ مقالہ شامل ہو رہا ہے۔ اب اس کی کتابت شدہ کاپیاں آپ کو روانہ ہوئی ہیں کہ قومی زبان میں چھپیں۔ اس (سے) قبل بھی یہ شخص آپ کی معرفت نگار ہی (پر) ایک چیز چھاپ چکا ہے۔ اگر اب کے نگار والا مقالہ شائع ہوا تو مجھے از حد رنج ہوگا۔ اس شخص (کو) لاہور میں بعض لوگوں نے آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ جو کالج کے علاوہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ صحیفہ میرے ہاتھ میں (نہ) رہے۔

۶۹۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۷

۷۰۔ سعادت حسن منٹو

۷۱۔ کوائف دستیاب نہ ہو سکے۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸

۷۲۔ والد گرامی کا یہ مضمون (اقبال کے حضور) "نقوش" لاہور کے اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا۔ مذکورہ مضمون والد گرامی بعد از وفات شائع ہونے والی کتاب "اقبالیات خواجہ" (مرتبہ خواجہ عبدالرحمٰن طارق مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۷ء، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور) میں بھی شامل ہے۔ ص: ۴۴۔۱۰۷

۷۳۔ ممتاز بھارتی محقق، نقاد اور ادیب۔

۷۴۔ ڈاکٹر محمد حسن اور مکتوب الیہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے شاگرد رہ چکے ہیں۔

۷۵۔ پ: ۷ نومبر ۱۹۳۰ء (موضع سرائے ساہو، ضلع چھپرا، بہار، بھارت) م: ۱۲ اپریل ۲۰۰۱ء (اسلام آباد) شاعر، نقاد، انشائیہ نگار اور صاحب اسلوب ادیب۔ علمی آثار: شہرت کی خاطر (انشائیے)، تاثرات و تعصبات (تنقیدی مضامین)۔ میرے خیال میں (تنقیدی مضامین)، جان پہچان (شخصی خاکے) نقش ہائے رنگ رنگ (جلد اول۔ رشید احمد صدیقی کے غیر مدون مضامین)، حسرت خیال (شاعری)۔

۷۶۔ سہ ماہی "فنون"، لاہور۔ مدیر احمد ندیم قاسمی۔

۷۷۔ سہ ماہی "اوراق"، لاہور۔ مدیر ڈاکٹر وزیر آغا

۷۸۔ ماہ نامہ "افکار"، کراچی۔ مدیر صہبا لکھنوی۔

۷۹۔ پ: ار دسمبر ۱۹۲۷ء (کھیولی، ضلع بارہ بنکی، یوپی) م: ار ستمبر ۱۹۸۳ء (کراچی) ممتاز نقاد، شاعر، ادیب اور کالم نگار۔ علمی آثار: "نئی نظم اور پورا آدمی"، "اقبال ایک شاعر"، محمد حسن عسکری۔ آدمی یا انسان، غالب کون؟، ادبی اقدار، ادھوری جدیدیت، چراغ نیم شب (شاعری)، بیاض

(شاعری)، اکائی (شاعری)

۸۰ پ: ار جولائی ۱۹۲۱ء (سنجر پور، ضلع جونپور، بھارت) م: ار اپریل ۱۹۸۹ء (کراچی)۔ معروف ادیب، ایک اہم نقاد، ڈراما نگار، افسانہ نگار، سابق وائس چانسلر، بلوچستان یونی ورسٹی، کوئٹہ۔ علمی آثار: ادب و آگہی، تہذیب و آگہی، نیم رخ، انکار (ڈراما)، انتظار سحر (افسانے)

۸۱ پ: ۱۵ر مارچ ۱۹۳۳ء (کھیولی، بارہ بنکی، یوپی) م: ۲ر جون ۱۹۹۳ء (کراچی) معروف نقاد اور ادیب۔ علمی آثار: ۲+۲=۵، سوال یہ ہے، برش قلم، تحریک پاکستان کا فکری، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر۔ سابق استاد (اردو) بلوچستان یونی ورسٹی، کوئٹہ اور کراچی یونی ورسٹی، کراچی۔

۸۲ کوائف دستیاب نہ ہوسکے۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸

۸۳ ایضاً

۸۴ پ: ۵ نومبر ۱۹۱۹ء (سراوہ، ضلع میرٹھ، یوپی) م: ۱۸ جنوری ۱۹۷۸ء (کراچی) صف اول کے نقاد، ادیب، افسانہ نگار، مترجم۔ سابق صدر شعبہ انگریزی، اسلامیہ کالج کراچی، علمی آثار: ستارہ یا بادبان (تنقید)، انسان یا آدمی (تنقید)، وقت کی راگنی (تنقید)، قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے (افسانے) جزیرے (افسانے)، ریاست اور انقلاب۔ لینن (ترجمہ)، میں نے لکھنا کیسے سیکھا، گورکی (ترجمہ)۔ معارف القرآن، جلد اول، مفتی محمد شفیع (اردو سے انگریزی ترجمہ)

۸۵ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ۔ پ: ۵ر اپریل ۱۹۰۴ء (منگلور، ضلع مانسہرہ)، م: ۱۴ر اگست ۱۹۸۶ء (لاہور)۔ نامور نقاد، محقق اور ادیب۔ سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، سابق صدر نشین اور مدیر اعلیٰ، معارف اسلامیہ پنجاب یونی ورسٹی۔ علمی آثار: ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، اشارات تنقید، کلچر کا مسئلہ، بحث و نظر، نقد میر، سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا، ولی سے اقبال تک، وجہی سے عبدالحق تک، مقالات اقبال، اطراف غالب، سخنور نئے اور پرانے۔

۸۶ ایک عرصے تک کے لیے انھوں (مکتوب الیہ) نے میر جملہ لاہوری کے قلمی نام سے اخباری کالم بھی لکھے اور طنزیہ کالم لکھ کر کوئی دوستوں کو ناراض بھی کیا، تاہم سچ تو یہ ہے کہ وہ مزے مزے کے کالم لکھتے تھے اور طعن و تضحیک سے بھی حسب ضرورت کام لیتے تھے۔ (ڈاکٹر وحید قریشی۔ ایک دیو قامت شخصیت، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ماہ نامہ الحمرا، لاہور، دسمبر ۲۰۰۹ء، ص: ۲۰)

۸۷ پ: ۷ مارچ ۱۹۱۴ء (لاہور)۔ م: ۲۳ جون ۱۹۸۹ء (کراچی۔ تدفین: لاہور)۔ معروف شاعر، نقاد، ڈراما نگار اور مترجم۔ علمی آثار: پون جھکولے (گیت) قندیل (شاعری) نعت مصطفیٰ (شاعری)، گھاس کی پتیاں (منظوم ترجمہ)، قلب و نظر کے فاصلے (کلیات شعری) ہم صفیر (ڈرامے)، اردو نثر انیسویں صدی میں، واسوخت امانت۔

۸۸ کوائف دستیاب نہ ہوسکے۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۸

۸۹ جمیل الدین عالی: زندہ شخصیات پر مضامین اور مقالات برائے پی ایچ ڈی عموماً متعلقہ شخصیات کی خواہش اور درخواست پر لکھوائے جاتے ہیں۔

۹۰ معروف بھارتی شاعر۔

۹۱ ماہ نامہ نگار، کراچی۔ مدیر ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔

۹۲ پ: ار جنوری ۱۹۳۳ء (کلکتہ، بھارت) م: ۱۹ دسمبر ۱۹۹۷ء (کراچی) نقاد، افسانہ نگار، صحافی۔ علمی آثار: غلام عباس۔ ایک مطالعہ، جدید اردو

افسانہ، ردعمل، ندیا کہاں ہے میرا دیس (افسانے)، اندھیری رات کا مسافر (ناول)۔

۹۳ پ: ۶/اپریل ۱۹۲۱ء (الہ آباد، بھارت) م: ۳۰ دسمبر ۱۹۹۵ء (کراچی)۔ ادیب، اعلیٰ حکومتی عہدیدار (بیوروکریٹ)، سابق اعزازی صدر، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔ ممتاز شاعرہ ادا جعفری کے شوہر۔ علمی آثار: منتشر یادیں (یادداشتیں)۔

۹۴ پ: ۱۲ جنوری ۱۹۰۱ء (پشاور) م: ۱۳ مارچ ۱۹۷۱ء (لاہور)۔ شاعر، قانون دان، بیگم سلمیٰ تصدق حسین کے شوہر۔ شعری آثار: سرود نو، لامکاں تا لامکان۔

۹۵ میاں محمد اسلم۔ پ: ۶ اگست ۱۹۸۵ء (لاہور)۔ م: ۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء (لاہور) میاں نظام الدین کے فرزند۔ دو سو کے لگ بھگ ناول لکھے۔ چند معروف ناول: گناہ کی راتیں، شمع، رقص زندگی، راوی کے رومان، شام غریباں۔

۹۶ پ: ۱۱۱ اگست ۱۹۱۸ء (گکھڑ، ضلع گوجرانوالہ) م: ۷/اگست ۱۹۹۵ء (لاہور)۔ شاعرہ، سابق رکن پنجاب اسمبلی (۱۹۴۶ء۔۱۹۵۳ء) سابق صدر پنجاب مسلم لیگ، اقوام متحدہ میں پاکستان کے پہلے وفد کی رکن، سابق رکن پنجاب اسمبلی (۱۹۵۳ء) سابق نائب وزیر محنت، سابق رکن وفاقی مجلس شوریٰ۔ شعری آثار: گل ہائے رنگارنگ۔

۹۷ پ: ۲۸ نومبر ۱۹۳۲ء (پھلور، ضلع جالندھر، بھارت) م: ۶/اکتوبر ۱۹۹۸ء (لاہور) مورخ، محقق، مترجم، سابق صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ علمی آثار: دین الٰہی اور اس کا پس منظر، تاریخی مقالات، سرمایۂ عمر، وضاحت مشاہیر پاکستان، خفتگان کراچی، سفرنامہ ہند، خفتگان خاک لاہور، وفیات اعیان پاکستان، ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت، محمد بن قاسم اور اس کے جانشین، Muslim Conduct of State (سلوک الملوک فارسی کا ترجمہ)

۹۸ پ: ۱۹۲۳ء (بٹالہ، ضلع گورداسپور، بھارت) م: ۷ مارچ ۲۰۰۴ء (لاہور) ادیب، افسانہ نگار، ماہر قانون دان۔ بہت سے اہم سیاسی مقدموں میں پیروی کی۔

۹۹ شیخ محمد اکرام۔ پ: ۱۰ ستمبر ۱۹۰۸ء (رسول نگر، ضلع گوجرانوالہ) م: ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء (لاہور) مورخ، مصنف، اعلیٰ سرکاری عہدیدار (بیوروکریٹ)۔ قابل قدر یادگار علمی آثار: آب کوثر، رودِ کوثر، موجِ کوثر، غالب نامہ، حیاتِ غالب، حکیم فرزانہ، شبلی نامہ، ارمغانِ پاک، ثقافت پاکستان۔

۱۰۰ امتیاز علی عرشی، مولانا۔

مکاتیبِ ڈاکٹر وحید قریشی بہ نام نذر صابری

ترتیب وتحشیہ: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

استاذ الاساتذہ ڈاکٹر وحید قریشی [۱۹۲۵ء ـــــ ۲۰۰۹ء] حقیقی معنوں میں کثیر الجہات اور متنوع صفات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہ یک وقت معلم، محقق، نقاد، شاعر، تدوین کار، مخطوطہ شناس، مبصر، منتظم اور دانش ور تھے۔ انھوں نے زندگی بھر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے اپنا رشتہ قائم رکھا۔ انھوں نے علم وادب کے مختلف میدانوں میں تحقیق وتدقیق کا وقیع اور اعلیٰ کام کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اُردو، فارسی، عربی، انگریزی اور پنجابی زبانوں کے علمی وادبی سرمائے وہ پوری طرح باخبر تھے اور معاصر ادب پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ لاہور کے مختلف کالجوں میں وہ تاریخ، فارسی، اُردو اور پنجابی کے استاد اور صدر شعبہ رہے۔ اوری اینٹل کالج، لاہور میں وہ صدر شعبۂ اردو و پنجابی، ڈین اور پھر پرنسپل کے عہدوں پر متمکن رہے۔ مقتدرہ قومی زبان، اقبال اکادمی پاکستان، بزمِ اقبال اور مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کے سربراہ مقرر ہوئے تو ان اداروں کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا۔ ان کی ادارت میں اوری اینٹل کالج میگزین، مجلّہ تحقیق، صحیفہ، سہ ماہی اقبال، اقبال ریویو، اخبار اُردو اور مخزن جیسے علمی وادبی رسائل وجرائد شائع ہوئے۔ ان کے زمانۂ ادارت میں یہ رسائل اپنے مندرجات اور مضامین کے اعتبار سے اعلیٰ معیار کے حامل دکھائی دیتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کو نام ور اور معتبر اہلِ قلم کا تعاون حاصل تھا اور وہ ان سے ان کی دل چسپی کے موضوعات پر مضامین لکھوانے میں کام یاب رہتے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تصنیفات وتالیفات اور مرتبات کی تعداد ساٹھ سے زیادہ ہے۔ اخبارات ورسائل میں مطبوعہ مضامین، کالم، فیچر، انٹرویو، تبصرے اور مکاتیب کی ایک بڑی تعداد ابھی غیر مدون ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی چند نمایندہ کتابوں کے نام یہ ہیں:

☆ میر حسن اور ان کا زمانہ ☆ مطالعۂ حالی ☆ اقبال اور پاکستانی قومیت
☆ اساسیاتِ اقبال ☆ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ☆ قائدِ اعظم اور پاکستان
☆ شبلی کی حیاتِ معاشقہ ☆ پاکستانی قومیت کی تشکیلِ نو اور دوسرے مضامین
☆ مثنویاتِ میر حسن ☆ باغ وبہار ایک تجزیہ ☆ الواح (مجموعۂ شاعری)

ادیبوں اور اہلِ فکر ونظر کے مکاتیب انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ مکاتیب کے آئینے میں ان کی زندگی کے اہم خال وخط اور ان کی شخصیت کے متنوع پہلو تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ متشکل ہوتے ہیں۔ مشاہیر کے خطوط جہاں ان کے علمی سرمائے کی تفہیم وتشریح میں مددگار ہوتے ہیں وہاں ان کی زندگی اور عصری علمی وادبی صورتِ حال کا اشاریہ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے مشاہیر کے خطوط کی

جمع آوری اور ترتیب وتہذیب انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ بیسویں صدی میں اہم اکابر کے خطوط کے مجموعے شائع ہوئے اور رسائل نے وقیع اور ضخیم مکاتیب نمبر شائع کیے جنھوں نے اس صنف کی ثروت اور وقعت میں اضافہ کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا حلقۂ احباب وتلامذہ نہایت وسیع تھا اس لیے ان کے تمام مکاتیب کی جمع آوری اور اشاعت وقت کی اہم ضرورت ہے۔ زیرِ نظر مضمون کے ذریعے ڈاکٹر وحید قریشی کے پانچ مکاتیب بہ نام نذر صابری پیش کیے جا رہے ہیں۔

نذر صابری عہدِ رواں کی ایک ممتاز علمی وادبی شخصیت ہیں۔ وہ شاعر، محقق اور مخطوطہ شناس ہیں۔ نذر صابری کا اصل نام غلام محمد ہے۔ آپ یکم نومبر ۱۹۲۳ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد کا تعلق جالندھر سے تھا۔ آپ کے والدِ محترم کا نام مولوی علی بخش تھا جو مولانا نواب الدین مدراسیؒ کے دست گرفتہ تھے۔ نذر صابری نے گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر سے میٹرک، اسلامیہ کالج جالندھر سے بی اے اور پنجاب یونی ورسٹی سے ڈپلوما ان لائبریرین شپ کی تحصیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اسلامیہ کالج جالندھر میں کتاب دار مقرر ہوئے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں پنجاب پبلک لائبریری میں اسسٹنٹ کیٹلاگر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ کالج کیمبل پور [حال اٹک] میں کتاب دار مقرر ہوئے اور سبک دوشی [۱۹۸۳ء] تک اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ صابری صاحب نے ۱۹۵۷ء میں محفلِ شعروادب اور ۱۹۶۳ء میں مجلسِ نوادراتِ علمیہ کی بنیاد رکھی۔ ان اداروں نے اٹک کے علمی وادبی افق کی تابانی میں اضافہ کیا۔ مجلسِ نوادراتِ علمیہ کے زیرِ اہتمام مخطوطات کی دو نمایشیں منعقد ہوئیں جنھیں ملک بھر میں قدر کی نظر سے دیکھا گیا۔ نذر صابری نے ولی دکنی کے معاصر، اٹک کے اولین اُردو وفارسی شاعر شاکر اٹکی کا دیوان شائع کیا۔ شیخ محمود اشنویؒ کی کتاب غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان والمکان کو پہلی بار اصل مصنف کے نام کے ساتھ شائع کیا۔ اس سے قبل یہ کتاب عراقی اور دوسرے صوفیہ کے ساتھ منسوب رہی۔ نذر صابری کی دیگر تصانیف وتالیفات میں قصۂ مشائخ (محمد زاہد اٹکی)، انتخابِ دیوانِ ظفر احسن، ارمغانِ اٹک، آفتابِ شوالک، لذتِ آشنائی، ظوائر اور واماندگیِ شوق شامل ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ نذر صابری صاحب کا دوستانہ اور نیازمندانہ تعلق تیس سال سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران میں ان کی ملاقاتیں بھی رہیں اور سلسلۂ مکاتبت بھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے زمانۂ صدر نشینیِ مقتدرہ قومی زبان کے کتب خانے کی فہرست سازی اور کیٹلاگنگ کے لیے نذر صابری صاحب کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ زیرِ نظر مکاتیب میں اس تعلقِ خاطر اور ارتباطِ علمی کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ راقم نے ان مکاتیب پر مختصر حواشی کا اضافہ کیا ہے، یہ حواشی متنِ مکاتیب کی تفہیم میں معاون ہیں۔

☆☆☆

[۱]

پنجاب یونیورسٹی

ڈاکٹر وحید قریشی
ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اوری اینٹل لرننگ

دفتر: یونیورسٹی اوری اینٹل کالج، لاہور
گھر: ۲۶۹-این، سمن آباد، لاہور- ۴۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء

مکرمی! تسلیم۔

ایک عزیز کی معرفت آپ کا ارسال کردہ تحفہ ملا۔ دیوانِ شاکر (۱) میرے پاس پہلے سے موجود تھا آپ کا ارسال کردہ یہ نسخہ میں مشفق خواجہ صاحب (۲) کو کراچی کے پتے پر بھیج رہا ہوں اگر ہو سکے تو انھیں ہدیے کے طور پر نوادراتِ علمیہ (۳) اور مخطوطات کی دوسری فہرست (۴) بھی ارسال فرما دیں۔ ان تحائف کے لیے میں آپ کا از حد ممنوں ہوں۔ آپ جو کام کر رہے ہیں، میری طرف سے کلی [دلی] مبارک باد قبول کیجیے۔ مکھڈ کے کتب خانے (۵) میں مثنوی مولانا روم کے جن دو نسخوں کا بقید سنین آپ نے حوالہ دیا ہے وہ بہت اہم ہے۔ (۶) میں مثنوی پر کچھ کام کر رہا ہوں۔ کیا ان دونوں نسخوں کی مائیکروفلم یا فوٹو سٹیٹ کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں میری مدد کر سکیں تو ممنون ہوں گا۔ اخراجات کا تخمینہ بتا دیجیے تاکہ اس کام کے لیے رقم بھجوا سکوں۔

والسلام
(وحید قریشی)

بخدمت جناب نذر صابری صاحب
گورنمنٹ کالج، کیمبلپور [کیمبل پور]۔

[۲]

پنجاب یونیورسٹی

ڈاکٹر وحید قریشی
ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اوری اینٹل لرننگ

دفتر: یونیورسٹی اوری اینٹل کالج، لاہور
گھر: ۲۶۹-این، سمن آباد، لاہور- ۴۔

۲۸ر جنوری ۱۹۷۶ء

مکرمی! تسلیم۔

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ مشفق خواجہ صاحب کا پتہ [پتا] یہ ہے:
مشفق خواجہ صاحب

۳۔ڈی ۹/۲۶، ناظم آباد، کراچی-۱۸

انھیں دونوں فہرستیں بھجوا کر ممنون فرمائیں۔ کتاب خانۂ شیرانی (۷) کے جس نسخے کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ پہلے سے میری نظر میں ہے۔ اپریل میں جب آپ مکھڈ جائیں گے تو مکھڈ شریف کے نسخے کے عکس کا بندوبست ضرور کیجیے۔ کیمبل پور میں فوٹو سٹیٹ کا انتظام یقیناً ہوگا۔ میری مشکل حل ہو جائے گی۔ نمایشِ نوادرات (۸) کے سلسلے میں اطلاع ضرور دیجیے۔ میں حاضرِ خدمت ہوں گا۔

والسلام

(وحید قریشی)

بخدمت جناب نذر صابری صاحب
گورنمنٹ کالج، کیمبل پور۔

[۴]

پنجاب یونیورسٹی

ڈاکٹر وحید قریشی
ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ

دفتر: یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
گھر: ۲۶۹-این، سمن آباد، لاہور-۴۔

(۹)

مکرمی! تسلیم۔

عزیز ایوب شاہد (۱۰) سے معلوم ہوا ہے کہ قلمی نسخہ (۱۱) آپ لے آئے ہیں۔ اس کا فوٹوسٹیٹ صاف نہ بن سکے گا۔ اگر آپ میری خاطر تھوڑی سی زحمت کریں اور لاہور آ جائیں تو جملہ اخراجات میں برداشت کروں گا اور دو دن کے اندر اندر آپ کی موجودگی میں مائیکروفلم بنوالوں گا۔ نسخہ آپ اپنے ہمراہ اور اپنی نگرانی میں مائیکروفلم بنوا کر واپس لے جائیں۔ میں اس کے لیے از حد ممنون ہوں گا۔

والسلام

(ڈاکٹر وحید قریشی)

چوہدری [چودھری] غلام محمد صاحب
لائبریرین، گورنمنٹ کالج، کیمبل پور۔

[۴]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقتدرہ قومی زبان

NATIONAL LANGUAGE AUTHORITY

مکان نمبر۱۰، گلی نمبر۳۲، سیکٹر ایف ۸/۱۔ اسلام آباد

۱۴/ مئی ۸۴[۱۹]ء حوالہ نمبر ط/ ۷/ ۸۴/(الف)۔

موضوع: لائبریری کی کتابوں کی کیٹالاگنگ اور درجہ بندی وغیرہ

مکرّمی صابری صاحب! تسلیم۔

جیسا کہ آپ سے زبانی بات ہو چکی ہے مقتدرہ قومی زبان کی لائبریری کی جملہ کتابوں کی کیٹالاگنگ، درجہ بندی اور شیلف کارڈ وغیرہ کی تکمیل کی بات آپ سے ہوئی تھی۔ اس کے لیے اب تک لائبریری میں درج ہونے والی جملہ کتابوں کے لیے بالمقطع ۶۰۰۰ روپے (چھ [چھے] ہزار روپے صرف) ادا کیے جائیں گے۔ ایک ٹائپ کار آپ کے ساتھ لگایا دیا جائے گا جو شیلف کارڈ اور کیٹالاگ کے تین کارڈ فی کتاب آپ کی رہنمائی میں تیار کرے گا۔ اس پر نظرِ ثانی آپ فرمائیں گے۔ یہ قومی خدمت ہے آپ اس میں ہماری مدد فرماتے ہوئے اس لائبریری کو صحیح حالت میں کر کے ہمیں بھی ممنون فرمائیں اور اردو زبان کے بہی خواہوں کو بھی اطمینان کا موقع فرمائیں۔ یہ کام مہینے ڈیڑھ مہینے میں مکمل فرمائیں تو نوازش ہوگی۔ (۱۲)

والسلام

(ڈاکٹر وحید قریشی)
صدر نشین

بخدمت گرامی

جناب چوہدری [چودھری] غلام محمد

سابق لائبریرین، گورنمنٹ ڈگری کالج، اٹک

[۵]

ڈاکٹر وحید قریشی

۲۶۹/ رائن، چمن آباد، لاہور

فون: ۴۱۲۷۹۷

۲۱ رفروری ۱۹۹۰ء

برادرم! تسلیم۔

آپ کا گرامی نامہ مل گیا حالات سے آگاہی ہوئی۔ میں خود آپ سے ملنے کا خواہش مند ہوں لیکن بیماری نے لمبے سفر سے روک رکھا ہے اس لیے آدھی ملاقات پر ہی گزارہ کرتا ہوں۔ برخوردار (۱۳) کے لیے میں جو کچھ کر سکتا ہوں حاضر ہوں۔ اس سے میں نے کہہ رکھا ہے کہ جب موقع ملے تشریف لایا کرے۔

اپنی کتاب دو ایک روز میں ارسال خدمت کروں گا۔ آپ آج کل کیا کر رہے ہیں؟ کیا کتابیات کا کوئی کام مغربی پاکستان اردو اکیڈمی (۱۴) کے لیے کر سکیں گے؟ (۱۵) والسلام

مخلص

(ڈاکٹر وحید قریشی)

بخدمت گرامی، جناب نذر صابری

نمبر ا، میونسپل پلازا، اٹک شہر

☆☆☆

حواشی وتعلیقات:

(۱) اٹک کے پہلے صاحب دیوان فارسی شاعر شاکر اٹکی کا دیوان سیّد رفیق بخاری اور نذر صابری نے ۱۹۷۰ء میں مجلس نوادرات علمیہ اٹک کے زیر اہتمام شائع کیا۔ اس دیوان میں تین اُردو غزلیں اور ایک دوہا بھی شامل ہے۔ شاکر بہ قول نذر صابری اٹک قدیم کی معروف روحانی شخصیت حضرت شیخ یحییٰ المعروف جی بابا اٹکی [م: ۱۱۳۳ھ] کا پوتا ہے۔ شاکر اٹکی کی اُردو غزلیات اور دوہے کی دریافت سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ شمالی ہند میں اُردو شعر وادب کی اشاعت کا باعث ولی دکنی کا اُردو دیوان ہے۔

(۲) نام ور محقق، شاعر اور کالم نگار۔ اصل نام عبدالحی۔ ۱۹ ردسمبر ۱۹۳۵ء کو خواجہ عبدالوحید کے گھر پیدا ہوئے۔ کم عمری میں کراچی چلے گئے جہاں ساری عمر گزار دی۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ انجمن ترقی اُردو میں بابائے اُردو کے دستِ راست رہے۔ ۱۹۹۴ء میں ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے تمغا برائے حسنِ کارکردگی پیش کیا۔ ۲۱ رفروری ۲۰۰۵ء کو انتقال ہوا۔ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: ابیات (مجموعۂ شعر)، اقبال از احمد دین (تدوین)، جائزۂ مخطوطات اُردو (تحقیق)، غالب اور صفیر بلگرامی (تحقیق)، تحقیق نامہ (مجموعۂ مقالات)، کلیات یگانہ (تدوین)، سخن در سخن (کالم مرتبہ مظفر علی سیّد)، خامہ بگوش کے قلم سے (کالم مرتبہ مظفر علی سیّد)، سخن ہائے ناگفتنی (کالم مرتبہ مظفر علی سیّد) سخن ہائے گسترانہ (کالم مرتبہ ڈاکٹر انور سدید) سن تو سہی (کالم مرتبہ ڈاکٹر انور سدید وخواجہ عبدالرحمٰن طارق)۔

(۳) نوادرات علمیہ: مرتب، نذر صابری، مجلسِ نوادرات علمیہ اٹک (کیمبل پور)، س ن۔

نوادرات علمیہ ان ایک سو گیارہ مخطوطات کی توضیحی فہرست ہے جو مجلسِ نوادرات علمیہ اٹک کی منعقدہ پہلی نمائش مخطوطات [۱۹۶۳ء] میں رکھے گئے تھے۔

(۴) اس سے فہرستِ نسخہ ہائی خطی فارسی مکھڈ شریف مراد ہے۔ اس فہرست میں مولانا محمد علی مکھڈیؒ کے کتب خانے میں موجود ۲۳۴ فارسی مخطوطات کو الف بائی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ فہرست نگار نذر صابری ہیں۔ اس فہرست کو مجلسِ نوادرات علمیہ اٹک (کیمبل پور) نے ۱۳۹۳ھ میں شائع کیا۔

(۵) مکھڈ تحصیل جنڈ ضلع اٹک کا ایک قدیم اور معروف قصبہ ہے۔ مولانا محمد علی مکھڈیؒ بٹالہ سے آئے اور اس قریے کو مستقل مستقر بنالیا۔ انھی کے خلفا اور جانشینوں نے ایک بہت بڑے کتب خانے کی بنا ڈالی۔ یہ کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈیؒ کے نامِ نامی سے منسوب ہے۔ اس میں نادر و نایاب مخطوطات کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ نذر صابری صاحب نے اس کتب خانے کی فہرست سازی کی ہے۔

(۶) کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈیؒ میں مثنوی مولانا روم کے آٹھ خطی نسخے ہیں۔ ان میں سے دو خطی نسخوں کا سالِ کتابت معلوم ہے۔ صابری صاحب نے اس کتب خانے کے فارسی مخطوطات کی فہرست ''فہرستِ نسخہ ہائی خطی فارسی'' کے نام سے شائع کی تھی۔ مثنوی کے دو خطی نسخے ۱۰۳۲ھ اور ۱۰۴۹ء کے مکتوبہ ہیں۔ اول الذکر نسخے کے کاتب محمد بن حسین بلخی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی انھی نسخوں سے استفادے کے خواہاں تھے۔

(۷) حافظ محمود شیرانی [۱۸۸۰ء۔ ۱۹۴۶ء] نے ملازمت سے سبک دوشی کے بعد اپنا کتب خانہ اور نوادرات پنجاب یونی ورسٹی کے کتب خانے کو فروخت کیے۔ اس ذخیرے میں عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی کے خطی نسخے، مختلف زبانوں کی مطبوعہ کتابیں اور سکے، مہریں، فرامین اور دیگر دستاویزات شامل ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری کے نجی ذخائر میں ذخیرۂ شیرانی اپنے نوادرات کے باعث نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

(۸) مجلسِ نوادراتِ علمیہ، اٹک نے مخطوطات کی دو نمائشوں کا اہتمام کیا۔ پہلی ۱۹۶۳ء میں جب کہ دوسری ۱۹۸۰ء میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو اس دوسری نمائش کی دعوت دی گئی تھی۔ انھوں نے دوسری نمائش میں شریک ہونے کا وعدہ بھی کیا مگر تشریف نہ لا سکے۔

(۹) خط تاریخ سے عاری ہے مگر مندرجات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس خط کو مئی ۱۹۷۶ء کا مکتوبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۱۰) معروف نقاد اور ادیب ڈاکٹر محمد ایوب شاہد مراد ہیں۔ آپ ۵ رجنوری ۱۹۵۱ء کو اٹک شہر میں پیدا ہوئے۔ اجداد کا تعلق کوہاٹ سے تھا۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول، اٹک سے پاس کیا۔ پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے اُردو کا امتحان فرسٹ کلاس فرسٹ میں پاس کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں ''شارحینِ غالب کا تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سرگودھا، راول پنڈی اور اٹک کے کالجوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ آج کل گورنمنٹ کالج اٹک میں اُردو شعبے کے صدر ہیں۔ دو کتابیں: شارحین غالب کا تنقیدی مطالعہ (دو جلدیں) اور اقبال کا تصورِ توانائی شائع ہو چکی ہیں۔ تین کتابیں: اقبال اور اجتہاد، فکرِ اقبال میں مظاہر فطرت کی علامتی معنویت اور فلسفۂ وحدت الوجود اور غالب ہنوز تشنۂ اشاعت ہیں۔

(۱۱) مثنوی مولانا روم کے ۱۰۳۲ھ کے مکتوبہ نسخے کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۲) نذر صابری صاحب نے ڈاکٹر وحید قریشی کی درخواست پر مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے کتب خانے کی کیٹلاگنگ اور درجہ بندی کا کام متعینہ وقت میں انجام دیا۔

(۱۳) برخوردار سے مراد عبدالعزیز ساحر [پ: ۹ راپریل ۱۹۶۶ء] ہیں۔ ساحر صاحب اُس وقت گورنمنٹ کالج، لاہور میں ایم اے اُردو کے طالب علم تھے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد گورنمنٹ کالج جھیکا گلی مری، گورڈن کالج راول پنڈی میں اُردو کے استاد رہے۔ آج کل علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی میں شعبۂ اُردو کے چیئرمین ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی سے ''اُردو غزل میں فلسفۂ وحدت الوجود کی فکری معنویت'' کے موضوع پر کام کیا۔ جمیل الدین عالی کی نثر نگاری، جمیل جالبی فن اور شخصیت، افتخار عارف فن اور شخصیت، ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ سوانح و کتابیات ان کی کتابیں ہیں۔

(۱۴) مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور کا ایک اہم علمی ادارہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس کے بانی اور سربراہ تھے۔ اس ادارے نے نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی۔ علمی، ادبی اور تحقیقی موضوعات پر اس ادارے نے بیسیوں کتابیں شائع کیں۔ آج کل پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس ادارے کے سربراہ ہیں۔

(۱۵) صابری صاحب اس ادارے کے لیے کتابیات کا کوئی کام نہ کر سکے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی چند تصنیفات و تالیفات

محمد عارف

۱۔ وحید قریشی، اردو نثر کے میلانات ۔۔۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۸ء۔ ۱۶۰ص

۲۔ وحید قریشی، اردو کا بہترین انشائی ادب: رجب علی بیگ سے دور حاضر تک ۔۔۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۹ء۔ ۴۷۱ص

۳۔ وحید قریشی، ادب پارے ۔۔۔ لاہور: ٹیکسٹ بک کارپوریشن، ملتان: س ن۔ ۲۱۴ص

۴۔ وحید قریشی (مرتب)، ارمغان ایران ۔۔۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱۔ ۲۰۴ص

۵۔ وحید قریشی (مرتب)، اساتذہ اور ریسرچ سکالروں کی فہرست ۔۔۔ لاہور: سنگ میل، ۱۹۷۰ء۔ ۲۱۵ص

۶۔ وحید قریشی، اساسیات اقبال ۔۔۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء۔ ۳۱۲ص

۷۔ وحید قریشی، اقبال اور پاکستانی قومیت ۔۔۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء۔ ۱۴۳ص

۸۔ وحید قریشی، اقبال اور نظریہ وطنیت ۔۔۔ لاہور: مجلہ تحقیق، ۱۹۷۰ء۔ ۴۷۱ص

۹۔ وحید قریشی، اردو ادب کا ارتقا: ایک جائزہ ۔۔۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۴ء۔ ۱۸۴ص

۱۱۔ وحید قریشی، انتخاب دیوان سودا ۔۔۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء۔ ۱۸۶ص

۱۲۔ وحید قریشی، افسانوی ادب ۔۔۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۸۸ء۔ ۲۷۲ص

۱۳۔ وحید قریشی، الواح ۔۔۔ فیصل آباد: قرطاس، ۱۹۸۴ء۔ ۸۰ص

۱۴۔ وحید قریشی، ارمغان علمی نیاس، مرتب رفیع الدین ہاشمی ۔۔۔ لاہور: القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۸ء، ۵۸۴ص

۱۵۔ وحید قریشی، باغ و بہار: ایک تجزیہ ۔۔۔ لاہور: سنگ میل، س ن۔ ۱۴۴ص

۱۶۔ وحید قریشی (مرتب)، ۱۹۶۵ء کے بہترین مقالے ۔۔۔ لاہور: البیان، ۱۹۶۶ئع۔ ۳۶۸ص

۱۷۔ وحید قریشی، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ۔۔۔ لاہور: ایجوکیشنل ایمپوریم، ۱۹۷۳ئع۔ ۲۷۳ص۔

۱۸۔ وحید قریشی، پاکستان قومیت کی تشکیل نو اور دوسرے مضامین ۔۔۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء۔ ۱۸۲ص

۱۹۔ وحید قریشی، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ۔۔۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء۔ ۵۸۰ص

۲۰۔ وحید قریشی، تعلیم کے بنیادی مباحث ۔۔۔ اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، ۱۹۸۴ء۔ ۲۰۳ص

۲۱۔ وحید قریشی، تحریک پاکستان کے ثقافتی عوامل ۔۔۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء۔ ۲۰۳ص

۲۲۔ وحید قریشی، تنقیدی مطالعے ۔۔۔ لاہور: مکتبہ کاروان، ۱۹۶۶ء۔ ۲۳۵ص

۲۳۔ وحید قریشی، جدیدیت کی تلاش میں ۔۔۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء۔ ۴۱۴ص

۲۴۔ وحید قریشی (مرتب)، دیوان سودا ۔۔۔ لاہور: سنگ میل، س ن۔ ۲۰۶ص

۲۵۔ وحید قریشی (مرتب)، دیوان آتش؛ تجزیہ اور تنقید ۔۔۔ لاہور: لاہور: مکتبہ میری لائبریری، س ن۔۱۵۲ص
۲۶۔ وحید قریشی (مرتب)، دیوان جہاں دار ۔۔۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء۔۱۷۷ص
۲۷۔ وحید قریشی، شبلی کی حیات معاشقہ ۔۔۔ لاہور: ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، ۲۰۰۲ء۔۱۰۱ص
۲۸۔ وحید قریشی (مرتب)، صحیفہ کتاب غالب ۔۔۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء۔۲۲۵ص
۲۹۔ وحید قریشی (مرتب)، علامہ اقبال کی تاریخ ولادت: (ایک مطالعہ) ۔۔۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۰ء۔۱۰۱ص
۳۰۔ وحید قریشی، فہرست مقالات وتصانیف ۔۔۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء۔۲۰۴ص
۳۱۔ وحید قریشی، قائداعظم اور تحریک پاکستان ۔۔۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۰ء۔۱۰۳ص
۳۲۔ وحید قریشی، قرآن حکیم کی روشنی میں تعلیم ۔۔۔ لاہور: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۵ء۔۲۴۴ص
۳۳۔ وحید قریشی، قومی زبان اور ہمارا قومی تشخص ۔۔۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء، ۱۷۴ص
۳۴۔ وحید قریشی، قواعد انشا ۔۔۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۸ء۔۲۷۲ص
۳۵۔ وحید قریشی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ۔۔۔ لاہور: مکتبہ ادب جدید، ۱۹۹۳۔۳۲۰ص
۳۶۔ وحید قریشی (مرتب)، مثنوی سحر البیان ۔۔۔ کراچی: رسالہ اردو، ۱951ء۔۲۸۴ص
۳۷۔ وحید قریشی، مطالعۂ حالی ۔۔۔ لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء۔۲۰۶ص
۳۸۔ وحید قریشی (مرتب)، مقدمۂ شعر وشاعری ۔۔۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۷۰ء۔۴۲۸ص
۳۹۔ وحید قریشی (مرتب)، منتخب مقالات: اقبال ریویو ۔۔۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، س ن۔۵۱۷ص
۴۰۔ وحید قریشی، مقالات تحقیق ۔۔۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۸ء۔۲۷۲ص
۴۱۔ وحید قریشی، مطالعۂ ادبیات فارسی ۔۔۔ لاہور: یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۹۶ء۔۳۱۳ص
۴۲۔ وحید قریشی، میر حسن اور ان کا زمانہ ۔۔۔ لاہور: اردو بک سٹال، ۱۹۵۸ء۔۲۱۸ص
۴۳۔ وحید قریشی، نذر غالب ۔۔۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء۔۱۸۸ص
۴۴۔ وحید قریشی، نقد جاں ۔۔۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء۔۱۶۰ص
۴۵۔ وحید قریشی، ہمارا نظام تعلیم اور قومی زبان ۔۔۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء۔۱۹۶ص
۴۶۔ وحید قریشی (مرتب)، یارنامہ ۔۔۔ لاہور: پنجابی ادب، ۱۹۶۳ء۔۴۸ص
۴۷۔ وحید قریشی (مرتب)، یونی ورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور درسی سرمایہ ۔۔۔ لاہور: دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۰ء۔ ۵۵۲ص
۴۸۔ وحید قریشی، یادوں کا زنداں ۔۔۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء۔۳۱۴ص

49- Waheed Qureshi, Ideological foundations of Pakistan.- Lahore: Aziz Publications, 1982, 168p

50- Waheed Qureshi, Oriental Studies: The Indian Persian and other essays.- Lahore: Islamic Book Service, 1969. 174p

انتخاب تازہ کلام ڈاکٹر وحید قریشی

اظہر غوری

ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری اپنے عہد کی دستاویز بھی ہے اور تاریخ بھی۔ وہ اپنی تخلیقی سرگرمی میں بھی اتنے ہی محور ہے، جتنا کہ عمر بھر تحقیقی وتدریسی اور تنظیمی مشاغل میں مصروف تھے۔ ان کا اولین مجموعۂ کلام 'نقد جاں' ۱۹۷۰ء میں لاہور سے، جب کہ دوسرا مجموعۂ کلام 'الواح' ۱۹۸۴ء میں فیصل آباد سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی شعری اصناف غزلوں، پابند نظموں، آزاد نظموں، رباعیوں، قطعوں، دوہوں اور طنز و مزاح پر مشتمل ہیں اور ہر صنف میں ان کی تخلیقات اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے ہاں ہر صنف شاعری کا کلام گیت سا مترنم و رواں اور مرکز موضوعات جس قدر سرخوشی سے سرشار ہے، اسی قدر سوز و درد سے معمور۔ ان کی شاعری میں رمز و کنایہ اور کاٹ دار طنز سماجی، معاشی اور سیاسی شعور کا آئینہ دار ہے۔

چند ایک شاگردان عزیز ان کی غیر مطبوعہ شاعری ادبی جرائد کو بھجواتے، بالخصوص ڈاکٹر ضیاء الحسن پر وہ اپنے شاعرانہ مستقبل کے ضمن میں بے حد اعتماد کا اظہار کرتے، اسی سبب انھوں نے اپنی تمام تر غیر مطبوعہ شاعری انھیں کے سپرد کر رکھی تھی۔ یہ انتخاب بھی ڈاکٹر ضیاء الحسن کے شکریہ کے ساتھ انھی کے مملوکہ بیاضوں سے کیا گیا ہے۔

حمد باری تعالیٰ

تُو جسے شوکت دارائی دے	علم و حکمت کی توانائی دے
جس نے دس پارے کیے ہیں تخلیق	اس کو توفیق جبیں سائی دے
جن کو دعویٰ ہے جہاں سوزی کا	ان کو ذوق چمن آرائی دے
پیکر شعر اثر سے خالی	اسے افکار کی رعنائی دے
بخش ملاّ کو بھی امعان نظر	پھر اسے طاقت گویائی دے
تیری رحمت کے طلب گار ہیں لوگ	جو ہے جس شے کا تمنائی، دے
ہم کہ محروم سکون دل ہیں	ہم کو خیرات شکیبائی دے
جو رفیق سفر راہ بنیں	ان کو تو دانش و بینائی دے
تاب نظارہ کہاں ہے باقی!	دینے والے ہمیں تنہائی دے

ہم کہ بیٹھے ہیں سرِ کوے حرم ہم کو جنت کی پذیرائی دے

-☆-

خبر کیا تھی

خبر کیا تھی
بوڑھاپا اپنی شدت سے
خمیدہ پشت ہو کر مسکرائے گا
ستاروں کی طرح سے جگمگائے گا

خبر کیا تھی
رگ و پے میں محبت سرسرائے گی
نئے منظر دکھائے گی

تہِ سنگ سیہ خاموش سناٹا
اسے معلوم کیا ہو گا
ہوا کا آخری جھونکا
ابھر کر ڈوب جاتا ہے
کلیجہ منہ کو آتا ہے
خبر کیا تھی!

-☆-

جہاں دیوارِ گریہ ہے

چمن مہکے تو مہکے
پر زباں جلتی نہیں دیکھی
کوئی شعلہ تمنا کا
زمیں کو راکھ کر دے گا

ستاروں سے پرے بھی روشنی ہے
جو چمکتی ہے
بگولے شام کے صحراؤں میں جب رقص کرتے ہیں
نہ جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں

(۲)

وفا کی آخری دہلیز پر بیٹھے ہوئے لوگو!
تمھیں اپنے مقدر کی قسم
کڑے کوسوں کہاں تک جستجو کو درپے آزار رکھو گے
کبھی افغانیوں کے خون کی قیمت چکاؤ گے
نئے صدمے اٹھاؤ گے
کہاں تک چلتے جاؤ گے
ابھی مکرو ریا کی خواب گاہوں میں پرندے چہچہاتے ہیں
سمندر مسکراتے ہیں
رکو گے ڈوب جاؤ گے

(۳)

زمانہ ریگ صحرا ہے
کہ موج تند دریا ہے
ہمیں تو لوٹ جانا ہے
ہمیشہ آگ میں جلنا
سر صحرا صف ماتم
سمندر فاتح عالم
نہ جانے ابرہہ کے کتنے لشکر آنے والے ہیں
جہاں دیوار گریہ ہے
وہیں اپنا ٹھکانا ہے

☆

غزلیات

ہم نے کچھ دن زندہ رہنے کا ارادہ کر لیا
یعنی فرطِ شوق میں کچھ کچھ زیادہ کر لیا

جس کی روپوشی سے قائم تھیں حکایاتِ وفا
اہلِ دنیا نے انھیں کو بے لبادہ کر لیا

جس کی خاطر ہم نے ساری زندگی برباد کی
وہ سفر یاروں نے خود ہی پا پیادہ کر لیا

خود کو کر لیں گے اسیرِ جام و بادہ ایک دن
بیٹھے بیٹھے یار لوگوں نے ارادہ کر لیا

زندگی کو یوں بسر کرنا کوئی آساں نہ تھا
سوچتے ہیں کس لیے آخر زیادہ کر لیا

ہم حسابِ بیش و کم میں دیر تک الجھے رہے
کرنے والوں نے تو پل بھر میں ارادہ کر لیا

عمر بھر اس کو رہی ہے سادہ رستوں کی تلاش
شیخ نے خود کو اسیرِ جام و بادہ کر لیا

زندگی نے سانس لینے کی ہمیں مہلت نہ دی
زندگی کو پیس کر ہم نے برادہ کر لیا

☆

امنِ عالم ہے آج کل دشوار
فاختائیں ہیں درپے آزار

موسم آیا بیان بازی کا
مومنو کو نویدِ فصلِ بہار

اپنی تعریف، غیر کی توصیف
یہی شعر و ادب کے بھی شہکار

رند و عابد میں ٹھن گئی شاید
آ رہی ہے صدائے مارا مار

وقت ہر لمحہ رخ بدلتا ہے
کون تھامے گا وقت کی رفتار

آپ کس کس سے لڑ کے جیتیں گے
ساری دنیا ہے درپے آزار

ڈیل والا مکر بھی سکتا ہے
بےنظر ذرا رہو ہوشیار

☆

آپ سے کیسے دوستی کرتے
عمر گزری ہے زندگی کرتے

ہم کہ مصروفِ کارِ دنیا تھے
وقت ملتا تو دوستی کرتے

لوگ ساری حدیں پھلانگ گئے
دوستی کرتے، دشمنی کرتے

شاعروں نے گنوائی عمرِ عزیز
عہدِ رفتہ کی پیروی کرتے

حوصلے پست ہو گئے اپنے
اس سے پہلے کہ عاشقی کرتے

فاقہ مستی میں راتیں کاٹی تھیں　　دن گزارے ہیں شاعری کرتے
بے خیالی میں سر ہلا دیتا　　ہم اگر ذکر سرسری کرتے

-☆-

غیر پر اعتماد کرتا ہے　　صدق دل سے فساد کرتا ہے
آج دشمن کا دم غنیمت ہے　　کوئی تو ہم کو یاد کرتا ہے
کل مجاہد تھا، آج دہشت گرد　　تو یہ کیسا جہاد کرتا ہے
کوئی کرتا ہے بیٹھ کر انصاف　　کوئی حسب مراد کرتا ہے
جانے والوں کو یہ نہیں معلوم　　کون مشکل سے یاد کرتا ہے
لہریں گنتا ہے جو لب دریا　　وہ بھی آخر جہاد کرتا ہے

-☆-

روز دشمن سے لڑنا پڑتا ہے　　ایسا مشکل جہاد کون کرے
مارشل لا ہے روز کا معمول　　اس سے جھگڑا فساد کون کرے
آپ یوٹرنیے زمانے کے　　آپ پر اعتماد کون کرے
آپ کا درس، درس جمہوری　　اس کو ڈنڈے سے یاد کون کرے
سبھی وردی کے ہو گئے دشمن　　میرے ہردے کو شاد کون کرے

-☆-

طنز و مزاح

تال پر ناقۂ لیلیٰ ناچے　　قیس کے ہاتھ میں شہنائی دے
ہم کو دے حورِ بہشتی لیکن　　یار کو یار کی ہمسائی دے
جو بھی حائل ہو ترے رستے میں　　اس کو تو زور کی مہنگائی دے
پہلوانی کو جو ٹھنڈا کر دے　　پیرِ سرحد کو وہ سردائی دے
تو وزیروں کو تو کرتا ہے نہال　　کچھ مشیروں کو بھی سرسائی دے
میں گراں گوش ہوں غالب کی طرح　　زور سے بول، سنائی دے

-☆-

دیکھ روشن خیالیاں تیری
چھپتی پھرتی ہیں سالیاں تیری

تیری باتوں میں ہے اثر کتنا
کتنی میٹھی ہیں گالیاں تیری

پھر سے فصل بہار آئی ہے
پھول تیرے ہیں، ڈالیاں تیری

تیرے در کے غلام ہیں سارے
صاف کرتے ہیں نالیاں تیری

ملک خوش حال، کوئی خوف نہ ڈر
واہ نازک خیالیاں تیری

جن میں طوفان اٹھتا رہتا ہے
چائے کی ہیں پیالیاں تیری

کون جیبیں ٹٹولتا ہے تری
کون گنتا ہے پسلیاں تیری

کون تیرے قصیدے کہتا ہے
کون لکھتا ہے وصلیاں تیری

جمع جلسے میں ہیں پُلس والے
خوب بجتی ہیں تالیاں تیری

-☆-

تو نے دانے جو آج چبے ہیں
کچھ بتا یہ کہاں سے لبھے ہیں

تجھ کو معلوم ہے مرے مولا
کون بچے ہیں؟ کون کبھے ہیں؟

عاشقوں کی یہی تو ہے پہچان
ہٹ کے پکے ہیں اور کبے ہیں

سارے لیڈر ہیں ایک ہی جیسے
قوم نے یہ کہاں سے لبھے ہیں

آج اس پارٹی میں، کل اس میں
لوگ سارے ہی ڈب کھڑبے ہیں

ان کے یاروں کو طعنہ کیا دیویں
یار اپنے بھی کچھ کڈھبے ہیں

تو جنھیں روشنی سمجھتا ہے
وہ سیاہی کے چند دھبے ہیں

سب گواچے ہوئے سے پھرتے ہیں
کس نے ڈھونڈے ہیں، کس نے لبھے ہیں

آج کپڑے جو تو نے پہنے ہیں
جسم پر تیرے خوب پھبے ہیں

وہ بزرگوں کو مانتے ہی نہیں
خود ہی بیٹے ہیں، خود ہی ابے ہیں

-☆-

گھر سے باہر کبھی فرصت میں نہ جانا ہرگز
پارک میں بیٹھ کے آنسو نہ بہانا ہرگز

واں اکیلے میں تو غنڈے بھی پکڑ لیتے ہیں
گھر سے نکلیں نہ کبھی صبح کو دانا ہرگز

شہر والے کئی الزام لگا سکتے ہیں
دیکھنا دیکھنا تم شہر نہ جانا ہرگز

منہ چھپانے سے اگر تم کو حیا آتی ہو
دیکھنا سب کو مگر منہ نہ چھپانا ہرگز

وہ تو ظالم ہے معطل بھی کرا دیتا ہے — اس کے گھر پورے تحمل سے نہ جانا ہرگز
کھلے جنگل میں یہ قانون کی باتیں توبہ — ایسا قانون کسی کو نہ دکھانا ہرگز

-☆-

رباعی/قطعہ

بغداد کو خاک و خوں میں غلطاں دیکھا — ہر شخص کو محصور بہ زنداں دیکھا
دل والوں نے جان دے کے بازی الٹی — دشمن کو پریشان و پشیماں دیکھا

-☆-

ٹھہرا ہوا ریل کا اشارہ دیکھوں — بجھتا ہوا زیست کا شرارہ دیکھوں
کس دشت میں رک گئی ہے چلتی گاڑی — اے کاش یہ منظر نہ دوبارہ دیکھوں

-☆-

آنے والوں سے لوگ ڈرتے ہیں — گلے شکوے کہاں وہ کرتے ہیں
وہ نہ اپنی خوشی سے جیتے ہیں — اور نہ اپنی خوشی سے مرتے ہیں

-☆-

جو بھی قبضہ جما کے بیٹھا ہے — سبھی جھک کر سلام کرتے ہیں
جب وہ کھا پی کے جانے لگتا ہے — جشن کا اہتمام کرتے ہیں

-☆-

مارشل لا کا دور آتا ہے — ہم تو سیدھا حساب کرتے ہیں
فوج ہم کو خراب کرتی ہے — فوج کو ہم خراب کرتے ہیں

قائداعظم لائبریری کی علمی و ادبی سرگرمیاں

ذکیہ عارف

۲۲ اکتوبر ۲۰۰۹ء

تعزیتی ریفرنس پروفیسر عبدالجبار شاکر

صدارت: جناب عنایت اللہ، صدر مجلس ادارت مجلہ مخزن

نظامت: جناب محمد تاج، چیف لائبریرین، قائداعظم لائبریری

اظہارِ خیال: جناب ڈاکٹر سلیم اختر، جناب امجد اسلام امجد، جناب پروفیسر سید عبدالرحمٰن بخاری، جناب ڈاکٹر محمد سعد صدیقی، جناب شیر افگن ملک، جناب شوکت حسین، محترمہ رعنا احسان زیدی، اور جناب عبدالرشید صاحب

اردو زبان کے معروف سکالر، پبلک لائبریریز پنجاب کے سابق ڈائریکٹر محترم پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم ۱۳/۱۲ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو علمی، ادبی اور مذہبی حلقوں کو سوگوار چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی علمی، ادبی، مذہبی اور انتظامی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے قائداعظم لائبریری میں ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو ایک تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کے آغاز میں تاج صاحب نے فرمایا کہ گزری ہوئی شخصیات کے کارناموں کی تفصیل پیش کرنا ایک روایت ہے جس میں اسلاف کے کارہائے نمایاں پیش کیے جاتے ہیں جو آنے والوں کے لیے ایک زینے کا کام دیتے ہیں اور یہ تعزیتی ریفرنس اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

محترمہ رعنا زیدی جو کہ مرحوم کے ساتھ ایک عرصہ آفس میں کام کرتی تھیں انھوں نے بتایا کہ ان کی نمایاں خوبیاں شرافت، شائستگی اور تہذیب تھی۔ اور سب سے بڑی خوبی ان کی فکر انگیز گفتگو تھی۔

شوکت صاحب ان کی دفتری زندگی کے شفیق رویوں کو زیر بحث لائے۔ بخاری صاحب نے ان کے طرز احساس پر بات کی اور کہا کہ ان کی ہر حرکت اور ہر انداز میں ان کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے اپنا عکس ہر فرد پر چھوڑا۔ دل سے دل کا تعلق ہو تو نسبتیں جڑتی ہیں اور یہ نسبتیں، بہت قریب کر دیتی ہیں اور مرحوم کے دل میں ان نسبتوں کا احساس نہایت گہرا تھا۔

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی نے کہا کہ مرحوم کی وفات نے ہمیں علمی طور پر یتیم کر کے رکھ دیا ہے اور ان کی موت ان کے گھر کا حادثہ نہیں بلکہ پوری علمی دنیا کا حادثہ ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی دوسروں کی حوصلہ افزائی تھی۔ امجد اسلام امجد نے مرحوم کی ذاتی علم اور کتاب کے ساتھ گہری محبت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ عبدالجبار شاکر مرحوم کی بنائی ہوئی ذاتی لائبریری واقعی دید کے قابل ہے اور

ان کا کتاب کے ساتھ رشتہ ایک جنونی کا تھا۔

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے مرحوم کی خوبیوں سے مرصع گفتگو کی۔ انھوں نے بتایا کہ اپنی چیزوں کو کسی دوسرے کے سپرد کرنا بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے لیکن مرحوم نے اپنی ذاتی ضروریات کو رد کر کے عوام کے لیے کتابوں کا ایک کثیر سرمایہ پیش کیا آخر میں اس ریفرنس کے صدر عنایت اللہ صاحب نے اس اجلاس کا اختتام کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں صحیح معنوں میں اسلام کا ڈائنا مک پہلو مرحوم کے خیالات میں ملتا ہے۔

۱۲۴ اکتوبر ۲۰۰۹ء

تعزیتی ریفرنس ڈاکٹر وحید قریشی

صدارت: عنایت اللہ، صدر مجلس ادارت، مجلہ مخزن

اظہار خیال: ڈاکٹر سلیم اختر، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر انور سدید، انتظار حسین، ڈاکٹر تحسین فراقی، تبسم کاشمیری، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، محمد حنیف شاہد اور انیس ناگی

قائداعظم لائبریری کے مجلہ مخزن کے مدیر، اردو زبان کے نقیب معروف ادیب، نقاد اور استاد پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو وطن عزیز کے علمی و ادبی حلقوں کو سوگوار چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ قائداعظم لائبریری نے مورخہ ۱۲۴ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا۔ پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا اور محمد تاج صاحب نے پروگرام کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے مرحوم کی شخصیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی یاد ہمارے دلوں میں تادیر تازہ رہے گی اور بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کو حکومت پاکستان نے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی اور اقبالیات کے انعام سے نوازا تھا۔ ان کی رحلت سے اردو ادب کی دنیا میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ حنیف شاہد نے کہا کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کو مرحوم کہتے ہوئے نہ صرف افسوس ہو رہا ہے بلکہ الفاظ زبان کا ساتھ نہیں دے رہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اپنی وفات کے بعد انھوں نے ہزاروں کی تعداد میں شاگرد چھوڑے ہیں۔

امجد اسلام امجد ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔ انھوں نے مرحوم کی علم دوستی پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ وہ ساری زندگی میرے لیے مشعل راہ رہیں گے۔ وہ علم و ادب میں سچے تھے اور ساتھ ہی عام زندگی میں بہترین جملہ بیانی، بہترین حس مزاح اور ایک اچھے استاد کی باقی خوبیوں کے ساتھ ساتھ دلچسپ انداز اور طلبہ کی سطح پر آ کر بات کرنا ان کی نمایاں خوبی تھی۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم بہت بہادر انسان تھے۔ جس نے جوانی سے لے کر بڑھاپے تک بیماری اور پریشانیوں سے مقابلہ کیا۔ ان کو کتاب سے عشق تھا وہ تاریخ اور تحقیق کے رفیق تھے۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے ان کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب کی پوری دنیا ان کے سوگ میں شامل ہے۔ اتنی شدید بیماری کے ایام میں بھی ان کی زندہ دلی اور معمول کے کاموں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ بہت بڑے محقق تھے۔

ڈاکٹر انیس ناگی نے ان کی زندگی کے آخری ایام پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ان کا جسم بہت سے حادثوں کے نرغے میں تھا وہ اپنے زندگی کے آخری ایام میں بھی کتابوں سے الگ نہ رہے جو ان سے کتاب کے گہرے رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی موت

علمی و ادبی میدان میں ایک ایسا خلا ہے جو کبھی پر نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر انور سدید نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک سادہ استاد تھے اور ان کی تحریروں سے انہوں نے بے حد استفادہ حاصل کیا۔ انھوں نے ایک اصل محقق کا کردار ادا کیا وہ حوالوں کے جعل سازی کے سخت خلاف تھے ان کا خیال تھا کہ ہمیں نقل سے بچنا چاہیے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے نزدیک وہ ایک معنوی استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ مرحوم کے شوق میں فقرے بازی کے علاوہ فوٹو گرافی بھی تھی۔ انھوں نے کیمرے کے استعمال کی جدید تکنیک پر معلومات جمع کیں اور جو محبت ان کو لفظ سے تھی یہ ہر کسی کا خاصا نہیں۔

انتظار حسین نے مرحوم کی اس خوبی کو بھی اجاگر کیا کہ نہ صرف ان کا اصل میدان تحقیق تھا بلکہ ان کی محبت پرانے مخطوطوں سے بھی تھی۔ ان کا تعلق زمانہ قدیم سے تھا، ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ یعنی ان کی زندگی میں کئی رنگ شامل تھے۔

آخر میں عنایت اللہ صاحب نے خطبہ صدارت دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر وحید قریشی کا میں بہت مشکور ہوں انھیں مرحوم کہتے ہوئے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے وہ مرحوم نہیں ہوئے بلکہ ہم محروم ہو گئے ہیں۔ وہ ۸۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے اس مجلس کو انجام تک پہنچاتے ہوئے کہا کہ ان کے شروع کیے گئے میگزین ''مجلّہ مخزن'' کو ہم زندہ رکھیں گے۔

اس ریفرنس میں مرحوم کے سیکڑوں شاگردوں نے شرکت کی۔

یکم مارچ ۲۰۱۰

نعتیہ محفل مشاعرہ

صدارت: جناب شہزاد احمد، مدیر اعزازی مجلّہ مخزن، قائد اعظم لائبریری

مہمان خصوصی: جناب عنایت اللہ

ربیع الاول کے موقع پر قائد اعظم لائبریری میں مورخہ یکم مارچ ۲۰۱۰ء کو ایک نعتیہ محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ظفر اقبال، ڈاکٹر خورشید رضوی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، خالد احمد، نجیب احمد، اعزاز احمد آزر، اسلم کولسری، اظہر غوری، اشرف جاوید، بشیر رزمی، احسان اللہ ثاقب، شہناز مزمل، صغریٰ صدف اور عفت علوی جیسے شعرائے کرام نے حصہ لیا۔ اس نعتیہ محفل مشاعرہ میں تمام شعرا کرام نے حضور اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ کو نعت کی شکل میں پیش کیا اور بڑھ چڑھ کر داد وصول کی۔ سیرت مبارکہ کے اس مشاعرے میں شرکا کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

۲۰ مئی ۲۰۱۰ء

تعزیتی ریفرنس محترمہ فرخندہ لودھی

صدارت: ڈاکٹر انور سدید

نظامت: محمد تاج

مقررین: ڈاکٹر سلیم اختر، عبدالوحید، پروفیسر صابر لودھی، محترمہ توصیف افضل، محترمہ نسیم بانو، پروفیسر خالد ہمایوں،

محمد ہارون عثمانی،

قائد اعظم لائبریری میں مورخہ ۲۰ مئی ۲۰۱۰ء کو گورنمنٹ کالج کی سابق چیف لائبریرین اور اردو، پنجابی زبان و ادب کی معروف ناول نگار کی طبعی موت کے موقعے پر ایک تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ملک کے مشہور اردو ادب کے دانشوروں اور لائبریرین حضرات نے مرحومہ کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو سراہا۔ پروگرام کے آغاز میں محمد تاج صاحب نے مرحومہ کی شخصیت کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ آپ کی علمی و ادبی خدمات کا سلسلہ طویل ہے ان میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو ایک لائبریرین اور ادیبہ میں ہونی چاہیے تھی۔ ان کی تحریریں پڑھ کر کہا جاتا تھا کہ افسانہ دوبارہ کہانی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ جو کہ اچھی تبدیلی تھی اور یہ تبدیلی مرحومہ کی طرف سے ہوئی ان کی کہانیوں میں ایک جز و مشترک ہے وہ ہے مٹی کی مہک اور ان کی کہانیوں کے جیتے جاگتے کردار۔

عثمانی صاحب نے ان کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کیا اور بتایا کہ میڈم نے پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن میں لائبریرینز کی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ لائبریرینز کو ۷ اگریڈ ملنا ان ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ایک طرف تو وہ اردو اور پنجابی ادب کی بہترین افسانہ نگار تھیں اور دوسرے لائبریرین کے میدان میں بھی اہم تھیں۔ ان کو ۲۰۰۳ء میں پرائڈ آف پرفارمنس سے نوازا گیا۔

میڈم افضل توصیف صاحبہ جو کہ مرحومہ کی دوست تھیں، انھوں نے ان کی موت پر ''تیرا للیا شہر لاہور'' کے موضوع پر ایک آرٹیکل لکھا اور کہا کہ اب فرخندہ لودھی پنجاب میں نہیں تو پنجاب ادھورا ہے۔ ان کے اپنے تو کوئی بچے نہیں تھے لیکن انھوں نے بہت سے بچوں کو پالا۔ فرخندہ کے ساتھ پنجابی کا دور انجام کو پہنچا۔ محترمہ نسیم بانو نے کہا کہ کہانی تو ہوتی ہی ختم ہونے کے لیے ہے، کہانی کو انجام دینے والے لوگ مرجاتے ہیں، کہانی لکھنے والے ہاتھ رک جاتے ہیں لیکن میڈم فرخندہ کی کہانیاں زندہ رہنے والی ہیں۔ عبدالوحید نے کہا کہ مرحومہ نے اپنی زندگی کے ۳۰ سال لائبریرینز اور لائبریری کی بہتری کے لیے گزارے۔ وہ ایک بے ضرر خاتون تھیں۔ اور بے ضرر لوگ انسانیت کے لیے تحفہ ہوتے ہیں لیکن اب یہ عظیم اور شاندار شخصیت اپنے فنا کے سفر پر روانہ ہو چکی ہے۔

خالد ہمایوں نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کہانی میں ان کا اپنا ایک مقام تھا۔ وہ ایک اعلیٰ Imagination کے ساتھ کہانی کا تانا بانا بنتی تھیں۔ ان کی تمام خدمات ان کے نام کو زندہ رکھیں گی۔

ڈاکٹر سلیم اختر جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز میڈم کے ساتھ شروع کیا تھا کہا کہ لائبریرینز کا پورا سروس سٹرکچر تبدیل کروانے کا سہرا مرحومہ کے سر ہے۔ وہ لائبریرین ہونے کے ساتھ ساتھ رائٹر بھی تھیں اس حوالے سے وہ کتاب کی دلدادہ تھیں۔ ان کی ہر کتاب نیا سنگ میل ثابت ہوئی۔

سعشہ خان نے کہا کہ وہ کتابوں کی مٹی صاف کرتے کرتے آج وہ منوں مٹی تلے جا چکی ہیں۔ ان کے اندر ''احساس'' ہی تھا جو ان سے افسانے اور ناول لکھواتا تھا اور یہ احساس ہی تھا جو لوگوں کی بہتری کے لیے اٹھی کھڑی ہوتی تھیں اور یہ احساس مرتے دم تک بلکہ زندگی کے آخری کربناک لمحات میں بھی زندہ رہا۔

پروفیسر صابر لودھی نے غم میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں بتایا کہ مرحومہ نے کبھی ساری زندگی میں اپنے کسی دوست، کسی کولیگ اور کسی بھی گھر کے فرد کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کی۔ انھوں نے نہ صرف خون کے رشتوں کو بلکہ منہ بولے رشتوں کو بھی نبھاتی تھیں۔

انھوں نے سلیقے اور ضبط کے ساتھ ساری زندگی گزاری۔

آخر میں صدر مجلس ڈاکٹر انور سدید مرحومہ کی ادبی اور ذاتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میڈم کو اس سال کے آغاز میں فالج کا پہلا حملہ ہوا لیکن انھوں نے اس کا مقابلہ کیا اور اپنے ادبی سفر کو اور تیز کر دیا۔ جس کا ثبوت ان کا پنجابی ناول جو کہ ۴۵۰ صفحات پر مشتمل ہے "جنڈ دا انگیار" ہے۔ انھوں نے ایک مثالی زندگی گزاری۔ لائبریرین شپ ان کا شعبہ تھا لیکن ادب ان کا عشق تھا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ میں فرخندہ کے اوپر جو کتاب لکھ رہا تھا وہ فرخندہ خود نہ پڑھ سکی۔ انھوں نے آخر میں فاتحہ خوانی کروائی اور ساتھ ہی یہ ریفرنس انجام کو پہنچا۔

۱۹ویں شمارے کے قلمی معاونین

عنایت اللہ، 73/5 منیر روڈ، لاہور کینٹ

ڈاکٹر تبسم کاشمیری، V 85 phase II ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور کینٹ 54792

ڈاکٹر ریاض قدیر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج آف سائنس، وحدت روڈ، لاہور

ڈاکٹر انور سدید، ۲۷۱، ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ڈاکٹر سلیم اختر، الجودت 569-c گلی 17 جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ڈاکٹر تحسین فراقی، صدر شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور

امجد اسلام امجد، N-275 ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، لاہور کینٹ

محمد حمزہ فاروقی، D-86 کلفٹن بلاک 4، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی V، کراچی

صابر لودھی، H 2 ـ 140 واپڈا ٹاؤن لاہور

قاسم محمود احمد، گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج، سانگلہ ہل

محمد سلمان بھٹی، ریسرچ سکالر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

پروفیسر محمد حنیف شاہد، ۷۰ا، جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

خواجہ عبدالرحمٰن طارق، معرفت سہراب عادل گیلانی صاحب، 6/2A ذوالفقار اسٹریٹ نمبر 11 آف خیابان قاسم، ڈی ایچ اے فیز نمبر VIII، کراچی

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

محمد عارف، لائبریرین، الحمرا آرٹ کونسل، شاہراہ قائداعظم، لاہور

اظہر غوری، ۲۱۔ تندسٹریٹ، شام نگر، چوبرجی، لاہور

ذکیہ عارف، لائبریرین، قائداعظم لائبریری، لاہور

ڈاکٹر وحید قریشی (مرحوم) ، ڈاکٹر طارق عزیز
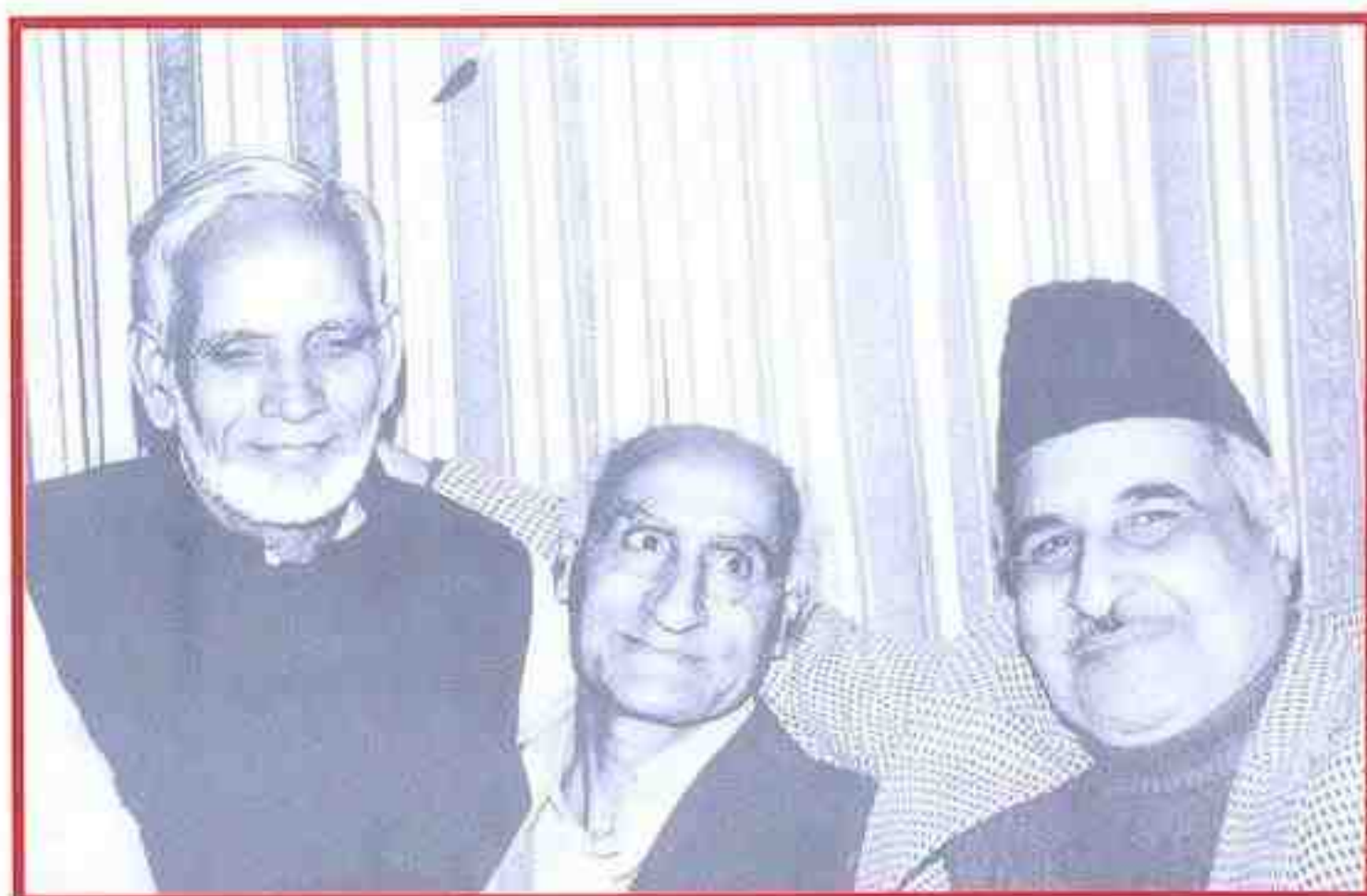
ڈاکٹر وحید قریشی (مرحوم) ، مرزا ادیب ، شریف کنجاہی